UNIVERSAL LIBRARY
OU_226085
UNIVERSAL LIBRARY

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ البالغ

کا

سینتالیسواں وعظ مسمّٰی بہ

اسرار عبادۃ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی و مولائی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم العالی

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون کے اہتمام سے چھپا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

اسرار العبادۃ

این	کہاں ہوا	مدرسہ انوار العلوم نامپلی حیدرآباد دکن
متی	کب ہوا	۱۴ محرم سنہ ۱۳۴۲ھ سہ شنبہ بعد فجر
کم	کتنی دیر ہوا	۲ ۱/۲ گھنٹہ
کیف	ہیئت بیان	کرسی پر بیٹھکر
لم	سبب وعظ	.
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	.
ماذا	کیا مضمون تھا	.
من ضبط	کس نے لکھا	احمد عبد الحلیم عفی عنہ۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۳۰۰
الاشتات	متفرقات	.

دعاء۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ

لہ ونشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی الہ
وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ
سَمِیًّا ۝ یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل کے جلسۂ وعظ میں تلاوت کی گئی تھی اور اُس جلسہ
میں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے قبل بھی اسکی تلاوت ہو چکی ہے گویا آج تیسری بار اسکی
تلاوت کی گئی ہے وجہ یہ ہے کہ ان دونوں جلسوں میں اس کے متعلق بیان مکمل نہ ہوا تھا
اس واسطے حاجت اعادہ کی ہوئی تاکہ اُس مضمون کی کسیقدر تکمیل ہو جاوے۔ اور کسی قدر اس
لئے کہا کہ پوری تکمیل کے لئے تو مدت دراز چاہئے حتی کہ تکمیل عرفی کے لئے بھی باقی تکمیل حقیقی کے
لئے تو تمام عمر بھی کافی نہیں مگر خیر ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے قاعدہ پر جتنی تکمیل بھی اس
مختصر وقت میں ہو سکتی ہے وہ تو کر دینا چاہئے بس ایسی حالت میں یہ تکمیل گویا بقدر
ضرورت ہی ہوگی یعنی جن (امور مہمہ کی طرف توجہ نہیں رہی اُن کی طرف متوجہ کر دیا جاوے گا کیونکہ
اصل ہمارے تمام امراض کی بے توجہی ہی ہے کہ ہمکو تکمیل دین کی طرف توجہ نہیں اور چونکہ بحمد اللہ
عقائد تو اُن لوگوں کے جو شہروں میں رہتے ہیں یا جو تعلیم یافتہ ہیں اور اُن کو صلحا کی صحبت میسر
ہے کافی درجہ میں صحیح ہیں اس لئے عقیدہ کے متعلق تو کسی جدید تعلیم کی ضرورت نہیں ہے البتہ
وہ مستحضر نہیں ہیں مگر ضرورت کے موقع پر اُن کا استحضار بھی ہو جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی اُن سے
پوچھے کہ تمھارا پروردگار کون ہے اور تم کس کی عبادت کرتے ہو تو وہی جواب میں کہیں گے
جو حاصل ہے اس آیت کا اس سے ثابت ہوا کہ وہ عقاید ذہن میں حاضر تو ہیں مگر دوسری
چیزیں ذہن میں اس قدر غالب ہو گئی ہیں کہ وہ حاضر بھی مثل غائب کے ہو گیا۔ شاید کسی کو
اس تقریر سے یہ خلجان ہوا ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ حاضر بھی ہیں اور پھر مثل غائب
کے ہیں تو میں اس شبہہ کے رفع کرنے کے لئے ایک مثال بیان کرتا ہوں مثلاً موٹی سی بات
ہے کہ خط لکھنے بیٹھئے تو کاغذ کا نظر آنا قلم کا نظر آنا روشنائی کا نظر آنا ضروری ہے مگر ان سب
کے نظر آنے کے واسطے ضیا کی ضرورت ہے دن کو بھی اور رات کو بھی دن کو آفتاب کی روشنی

کی مدد سے ہر چیز نظر آتی ہے اور رات کو لالٹین وغیرہ کی روشنی سے غرض نورانیت کی ضرورت ہر حال میں ہے کہ بغیر اس کے استعانت کے خط نہیں لکھ سکتے اور لکھتے وقت جب کاغذ پر اور حروف پر نظر پڑتی ہے تو اُس ضیا پر بھی ضرور پڑتی ہے بلکہ اول روشنی ہی پر نظر پڑتی ہے مگر سچ بتائیے کہ کبھی لکھنے کے وقت کسیکو بھی اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ اول ہماری نظر ضیاء پر پڑتی ہے عموماً کسیکو بھی اس پر التفات نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی لکھتے ہوئے آپ سے پوچھے کہ کیا اس وقت آفتاب نکل رہا ہے تو آپ بیساختہ کہیں گے کہ ہاں نکل رہا ہے اور اس جواب میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے مگر باوجود اس کے پھر بھی دوسری طرف کی توجہ نے اس توجہ الی الضیا کو مستور ہی نہیں بلکہ معدوم کر دیا ہے اب اس مثال سے آپ آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ذہن میں ہو موجود ہو اور پھر مثل غائب کے ہو بس اسی طرح عقائد کے دو درجے ہیں ایک تو مرتبہ تحقق و رسوخ کا ہے اور ایک مرتبہ استحضار و توجہ کا ہے جس کو دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ ایک مرتبہ علم کا ہے دوسرا مرتبہ حال کا ہے تو بحمد اللہ مرتبہ تحقق و رسوخ میں تو کمی نہیں ہے البتہ توجہ و استحضار میں کمی ہے حالانکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے اس لئے میں آج توجہ کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اس کا محل متعدد امور ہیں جن میں سے بعض کا بیان تو کر چکا ہوں اور بعض باقی ہیں اور وہ بعض باقی کلیات کے درجہ میں بیان کئے جا سکتے ہیں جزئیات میں اُن سے خود کام لے لیا جائے گا اس لئے ان کلیات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے یہ ہے مہم تمہید اور مفسر یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل عبادت ہے اور یہی روح ہے اس آیت کی اور اس کے قبل اسی کی تمہید ہے اور اس کے بعد اسی کی تاکید ہے چنانچہ بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں وہ روح یہ ہے فَاعْبُدُوْہُ جس کا ترجمہ یہ ہے عبادت کیجئے۔ عبادت کا لفظ ہر مسلمان کے کان میں برابر پڑتا رہتا ہے اور کثرت اطلاق سے معنی بھی اس کے قریب قریب سب کو معلوم ہیں جس سے اس کے معنی و مفہوم کے متعلق بیان کرنا تو کوئی نئی بات نہ ہوگی البتہ کمی یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت ہمارے ذہن میں نہیں آتی اور اسی لئے اس کے حقوق کی طرف بھی توجہ نہیں۔ چنانچہ جب ہم اپنی حالت کا موازنہ کرتے ہیں تو بہت شرم آتی ہے کہ قرآن میں تو عبادت

کے متعلق امر کا صیغہ ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت ضروری ہے اور یہاں اُس کا پتہ بھی نہیں تو اگر حقیقت عبادت کی معلوم ہو تو اُدھر توجہ بھی ہو اس لئے اُس کو بتلاتا ہوں اور بہت سہل عنوان سے بتلاتا ہوں سو عبادت کا وہ سہل عنوان ہے عبد شدن یعنے غلام ہو جانا تو فاعبدہ کے یہ ہوئے کہ غلام بن جاؤ اب اس عنوان ہی پر نظر کر کے اب آپ اپنی حالت کو دیکھ لیجئے کہ آیا ہم نے غلامی اختیار کی ہے یا نہیں اور اختیار کی قیدیں نے اس لئے لگائی کہ غلامی کی دو قسمیں ہیں ایک تو اضطراری وہ یہ کہ جس نے خریدا وہ مالک ہو گیا اور خریدشدہ غلام ہو گیا جسمیں غلام کے اختیار کو اصلا دخل نہیں سو اس قسم کی غلامی تو غلام کا کوئی کمال نہیں یہ تو ایجاب و قبول کے بعد بلا اُس کے اختیار کے ہو ہی جائے گا جیسے عورت پر طلاق کہ ادائے صیغ طلاق سے فوراً ہو جاوے گی چاہے عورت چاہے یا نہ چاہے یا کوئی مرجاوے تو متروکہ وارث کی ملک میں ہو جاوے گا خواہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے اور ایک غلامی اختیاری ہے کہ اپنے قصد سے کسی کا منقاد و مطیع ہو جاوے اسی کا لص میں امر ہے اور یہی کمال مطلوب ہے یہ وجہ اختیار کے قید لگانے کی اور اضطراری غلامی تو تمام مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے جس سے نکلنا محال ہے اور اوپر جو اضطراری غلامی کو وقوع طلاق و ثبوت ملک وارث کے ساتھ تشبیہ دی گئی اس پر کچھ مضمون ضروری اس طلاق و میراث کے متعلق یاد آگیا وہ بھی استطراداً عرض کئے دیتا ہوں طلاق کے متعلق میرے پاس ایک استفتا آیا تھا کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق دی۔ عورت نے کہا میں تو نہیں لیتی سائل نے پوچھا تھا کہ اس صورت میں طلاق ہوئی یا نہیں یہاں سے جواب گیا کہ طلاق ہو گئی عورت کے نہ لینے سے کچھ نہیں ہو سکتا اُس کو تو جھک مار کے لینا پڑے گی اور وہ نہ لے جب بھی پڑ جائے گی۔

ع

گر نہ ستانی بہ ستم میرسد

اب اگر کوئی عورت کہے کہ میری لیاقت اور شایستگی تھی کہ میں نے تمہاری خاطر سے طلاق کو قبول کر لیا۔ تو کیا کوئی عقلمند اس کا احسان مانے گا ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص اس کی بات پر ہنسے گا کہ سبحان اللہ یہ بڑا کمال کیا آپ نے۔ بھلا اُس کے نہ قبول کرنے سے ہوتا

کیا ہے ذرا قبول نہ کرکے تو دیکھ لیجئے مثلاً طلاق وانقضائے عدت کے بعد کے متعلق اگر عدالت میں نالش کرے اپنے نان ونفقہ کی تو عدالت خواہ رسمی ہو خواہ قانونی خواہ عرفی ہو خواہ شرعی یہی حکم کرے گی کہ چونکہ طلاق واقع ہوگئی اس لئے نان ونفقہ واجب نہیں رہا جب نہ قبول کرنے کا کچھ اثر نہیں تو قبول میں کچھ کمال بھی نہیں قبول کرنا اسی چیز کا کمال ہے جو نہ قبول کرنے سے رد ہو سکے۔ اسیطرح ملک اضطراری بھی کوئی کمال نہیں چنانچہ میراث میں بھی یہی ہے کہ ملک اضطراراً ثابت ہو جاتی ہے جو رد سے بھی رد نہیں ہوتی اگر ایک وارث یوں کہتا رہے کہ میں وارث نہیں بنتا۔ جب بھی وہ وارث ہوتا ہے۔ یہاں اس مثال پر ایک تفریع بھی ہے جس کے متعلق بعض اہل علم بھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی خاص وارث اپنا حق نہیں لینا چاہتا مثلاً بہن عام طور پر اپنا حق نہیں لیتی اور اسکی بنا ابتداءً تو ظلم سے ہوئی ہے مگر اب رسم عام ہوگئی کہ میراث میں سے حصہ لینا عورت کے لئے عیوب میں داخل سمجھا جاتا ہے اس واسطے وہ حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کہدیتی ہے کہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا حصہ بھائی لے لے تو اس کے اس کہنے سے بھائی اس بہن کے حصہ کا مالک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اول تو جب اس رسم ورواج کی بنا ظلم پر ہے تو بہن نے طیب قلب سے اپنا حصہ نہیں چھوڑا اور بدون طیب قلب کے کسی کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں۔ دوسرے اگر فرض کیجئے کہ اس کہنے کی بنا ظلم بھی نہو بلکہ طیب خاطر سے بھی کہدے تب بھی بوجہ اس کے اضطراراً مالک ہو جانے کے وہ حصہ اس کی ملک ہوگیا اور ملک ہو جانے کے بعد کوئی عقد انتقال ملک کا پایا نہیں گیا اس لئے وہ حصہ اس کی ملک سے خارج نہیں ہوا بلکہ وہ ترکہ میں سے اپنے حصہ کی بدستور مالک ہے اب اس مسئلہ کے چند فروع ہیں ایک یہ کہ اگر اس نے اپنی زندگی میں نہ لیا تو مرنے کے بعد بہن کی اولاد اس کا حصہ پاوے گی وہ اگر ماموں سے لینا چاہیں تو شرعاً مطالبہ کر سکتے ہیں اس میں غلطی کی بنا یہ ہوئی ہے کہ بہن کے اس کہنے کو کہ میں اپنا حصہ لینا نہیں چاہتی کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کافی نہیں اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اچھا پھر کیا کہیں کیا یوں کہدے کہ میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتی ہوں سو یہ بھی کافی نہیں کیونکہ ابراء دیون سے ہوتا ہے اعیان سے نہیں

ہوتا یعنے اگر کسی کے ذمہ میرے دس روپیہ آتے تھے اور میں نے کہا کہ میں نے یہ روپیہ معاف کردئے تو میرے اس کہنے سے قرض اُس کے ذمہ سے ساقط ہوگیا یہ تو ہے برات عن الدین اور اگر میرا قلمدان رکھا ہے میں نے کہا جاؤ میں نے تمھیں یہ قلمدان معاف کردیا تو اس کہنے سے نہ وہ میری ملک سے خارج ہوا نہ آپ کی ملک میں داخل ہوا ہاں وہبت تحلت اعطیت یا اور انھیں کے ہم معنے الفاظ کی ضرورت ہوگی اسی طرح تمام شرائط ہبہ کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اس واسطے بہن کے معاف کردینے سے وہ حق وراثت معاف نہیں ہوا اور نہ بھائی کی ملک میں داخل ہوا کیونکہ وہ حصہ عین ہے دین نہیں ہے اگر اُس کے واقعی دینے ہی کی ہو تو اُس کو الفاظ ہبہ کے ساتھ ہبہ کرنا چاہیئے یا بیع کرنا چاہیئے اور جو کچھ کرے اُس کے شرائط پورے کرنا چاہئے مثلاً اگر ہبہ کرے تو مسئلہ یہ ہے کہ قبل تقسیم کے ہبہ صحیح نہیں۔ مثلاً ایک جائداد قابل تقسیم ہے اور اُس میں بہن کا حصہ ہے اور بہن نے تقسیم سے پہلے ہبہ کیا تو یہ ہبہ جائز نہیں اور اگر تقسیم کے بعد ہبہ ہوا ہے تو بشرط قبض صحیح ہے۔ غرض ہبہ صرف کاغذی نہیں ہونا چاہیئے حسی و حقیقی ہونا چاہیئے کاغذ تو محض تکمیل ہبہ کی سند اور حکایت ہے جس سے پہلے محکی عنہ کا وجود ضروری ہے محض کاغذی کارروائی پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مہاجن تھا نہایت محاسب مگر عقل سے کورا وہ اپنے کنبہ کو ساتھ لیکر بیلی میں سوار ہوکر کہیں سفر کو نکلا راستہ میں ایک ندی پڑی بیلبان سے کہا ٹھہر جاؤ میں ذرا حساب لگالوں کہ پانی کتنا ہے بانس لے کے پانی میں اترا اور جہاں پانی کو بانس سے ناپ کر لکھ لیا کہ یہاں ایک ہاتھ ہے آگے دو ہاتھ ہے آگے چوتھائی بانس ہے اُس سے آگے، آدھا اور پھر ایک بانس ہے سو بعض جگہ ڈوباؤ کی مقدار بھی تھا مگر اس نے اس سرے سے اُس سرے تک سب ناپ کر حساب کرکے اوسط نکالا کہ کمر تک ہے تو بیلی کیوں ڈوبنے لگی بیلبان سے کہا چل وہ چلا آگے جاکے بیلی لگی ڈوبنے تو آپ نے پھر اپنا حساب جانچا کہ کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی حساب بالکل ٹھیک تھا تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں۔ میں نے اس واسطے یہ قصہ سنایا کہ خود قانون داں بھی اس کاغذی تقسیم کو حقیقی تقسیم سمجھتے ہیں حالانکہ شرعاً جو تقسیم مطلوب ہے وہ کاغذی نہیں کہ سہام قائم کردئے حسی حد بندی ہونا چاہیئے یہ تو ہبہ کے لئے قضاءً شرط ہے

ایک شرط دیانتاً بھی ہے وہ یہ کہ خوش دلی اور طیب خاطر سے ہونا چاہئے اگر خوش دلی نہیں ہے تو ہبہ سے ملک تو ہو جاوے گی مگر ملک خبیث رہے گی فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا۔ اس کی صریح دلیل ہے یہ آیت زوجین کے بارہ میں ہے اور ظاہر ہے کہ میاں بی بی میں جتنی بے تکلفی ہوتی ہے اتنی بھائی بہن میں نہیں ہوتی مگر دیکھئے کہ میاں بی بی کے بارہ میں بھی یہ ارشاد ہے۔ کہ اگر وہ مہر معاف کردیں طیب خاطر سے تو کھاؤ ورنہ نہیں بس جہاں اتنی بے تکلفی بھی نہیں وہاں کیونکر طیب خاطر کا لحاظ ضروری نہ ہوگا۔ نیز حدیث شریف میں ہے لا یحل مال امرأ مسلم الا بطیب نفس منہ اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ بہن جو دیتی ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیتی بلکہ بدنامی کے خوف سے دیتی ہے اس لئے یہ ہبہ عنداللہ صحیح نہیں ہوا باقی یہ کہ خوشدلی کیونکر معلوم ہو تو اُس کی صورت یہ ہے کہ جائداد تقسیم کرکے بہن کو اُس کے حصہ پر قبضہ کرادو اور دو تین سال تک اُسے جائداد کی آمدنی سے منتفع ہونے دو کہ اُسے جائداد کا حظ آجائے اور معلوم ہو جائے کہ زمینداری کیا چیز ہے اور روپیہ کیا چیز ہے اسکے بعد دیکھئے کتنی بہنیں حصہ دیتی ہیں اس طیب خاطر پر ایک اور فرع بھی متفرع ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آجکل چندہ کی عام رسم ہے اور اس کی کچھ پروا نہیں کی جاتی کہ دینے والا اجر و کراہت سے دیتا ہے یا کہ طوع و رغبت سے عام حالت یہ ہے کہ قصداً اجر و کراہت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے اسی لئے کسی صاحب اثر اور ذی وجاہت کو چندہ وصول کرنے کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے خواہ وجاہت دنیویہ ہو جیسے علماء و مشائخ اور خواہ دنیویہ جیسے عہدہ دار یا امراء۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ یہ چندہ حلال بھی ہوا یا نہیں اس کے لئے خود رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا فتوے کافی ہے لا یحل مال امرأ مسلم الا بطیب نفس منہ یعنے کسی شخص کا مال اُس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کی خوش دلی نہ ہو اس کے متعلق دو عذر کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ صاحب ہم نے خبر کہاں کیا کوئی تلوار تھوڑا ہی اُس کے گلے پر رکھی تھی کہ ہمیں زبردستی دو ہم نے تو سب سے یہ بھی کہدیا تھا کہ خوشی ہو دو ورنہ مت دو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کا یہ کہنا تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ کہیں دعوت میں جہاں صرف آپکو بلایا گیا تھا اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لے جائیں اور وہاں پہونچکر صاحب خانہ سے کہیں کہ صاحب

خوشی ہو تو یہ بھی دستر خوان پر بیٹھیں ورنہ نہیں۔ اب بتلایئے وہ کیا کہے گا زبان سے تو بیشک کہدے گا کہ اس پوچھنے کی کیا ضرورت ہے لیکن دل میں وہ کیا کہتا ہو گا اس کو خود سوچ لیجئے اگر کوئی آپ کے یہاں ایسا کرے تو آپ دل میں خود کہیں گے کہ یا اللہ یہ فوج کی فوج کہاں سے آ گئی مگر زبان سے یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب ضرور بیٹھیں تشریف لایئے سب آپ ہی کا تو ہے اب آپ ہی بتایئے کہ یہ خوشی ہے یا صرف الفاظ ہیں خوشی کے یقیناً خوشی سے نہیں کہا جاتا مگر زبردستی کوئی سر پر آ پڑے تو غریب کیا کرے کیا تہذیب کو چھوڑ کر صاف کہدے کہ یہ نہ بیٹھیں ایسی ہمت ہر ایک کو نہیں ہوتی ہاں بعضے صاف بھی کہدیتے ہیں۔ جیسے ایک شخص نے نماز کی نیت میں صفائی کی تھی سیاڈھورہ میں ایک واعظ آئے تھے وہ لوگوں کو لٹھ مار مار کے نماز پڑھاتے تھے ایک بوڑھے شخص کو زبردستی مسجد میں نماز کے لئے لائے وہ بیچارہ کھڑا ہوا اور نماز کی نیت کہلوائی تو آپ نے اس طرح نیت کی کہ نیت کرتا ہوں میں چار رکعت عصر کی منہ میرا طرف کعبہ شریف کے پیچھے اس امام کے ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر۔ بیچارہ صاف دل تھا خدا کو دھوکا نہیں دیا اگرچہ ظلم ہی سے پڑھی مگر پڑھی تو اور پھر صاف کہہ بھی دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اسکو چھپایا نہیں اس شعر کا عامل تھا ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند + حق را بسجودے و نبی را بدرودے

اس بیچارہ نے جیسی پڑھی تھی زبان سے بھی صاف کہدیا کہ اس کی نماز ہماری ریاء کی نماز سے تو اچھی تھی کہ ہم ظاہر میں خدا کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور نیت دوسرونکو دکھانیکی ہے اور پھر اس کو چھپاتے ہیں اسیکی نسبت فرماتے ہیں۔ ؎

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم + چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

حقیقت میں اس تقدس ریائی سے تو رندی اچھی لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ رندونکو تقدس کی ضرورت نہیں بلکہ یہ معنے ہیں کہ اہل تقدس کو ریا سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اور رندوں کو تقدس کی ضرورت نہ یہ کہ عابد تو عبادت چھوڑ دے اور رند رندی پر قائم رہے بلکہ گفتگو صرف یہ ہے کہ ان دونوں میں کون اچھا ہے تو وہی اچھا جس سے لوگوں کو دھوکا نہو۔ ؎

گناہ آمرز زنداں قدح خوار ✣ بہ طاعت گیر پیران ریا کار

تو جب اُس غریب نے زبان سے کہدیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور واقع میں تھا بھی ایسا ہی تو اُس نے دھوکا تو نہیں دیا مگر ایسے صاف گو اب کہاں جو چندہ میں زبان سے کہدیں کہ تمہارے ظلم سے دے رہا ہوں بلکہ غالب یہ ہے کہ زبان سے خوشی ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کراہت ہوتی ہے تو یہ چندہ بھی حلال نہیں ہوگا اور اب تو دعوتوں میں بھی ایک کی جگہ دو کے آنے سے گرانی ہوتی ہے کیونکہ اب پہلے کی سی ارزانی نہیں رہی اور ممکن ہے کہ یہاں پر کسیکو گراں نہ ہوتا ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں لوگوں کو ثروت دی ہے مگر جب ثروت سے زیادہ بار ہونے لگے تو سب ہی کو گرانی ہوگی مثلاً پچاس آدمی کی دعوت کی تھی اور دو سو آگئے تو داعی میں ثروت تو ہے کہ بازار سے منگا کر کھلا دیں گے مگر لوگوں کی نظر میں گر کر ہی تو ہو جاویگی کہ ان کے گھر میں کھانا نہیں تھا تو اس سے بھی بار ہو سکتا ہے اس لئے اپنے ساتھ بچوں کو لیجا کر صاحب خانہ سے پوچھنا کافی نہیں بلکہ لے جانا ہی نہ چاہیئے اس مقام پر شاید کوئی اس پوچھنے کی کفایت پر اس حدیث سے استدلال کرنے لگے کہ ایک شخص نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تھی اور ایک شخص راستہ سے آپ کی ساتھ ہو گیا جب آپ وہاں پہونچے تو آپ نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ بھئی تمہاری خوشی ہو تو یہ شخص آوے ورنہ نہیں صاحب دعوت نے کہا کہ خوشی ہے کہ آوے۔ میں کہتا ہوں بس آپ نے ایک حدیث پر نظر کی دوسری حدیث پر نظر نہیں کی وہ یہ کہ ایک شخص فارس کا رہنے والا شوربا اچھا پکاتا تھا۔ ایک روز اُس کا جی چاہا کہ حضور کو بھی کھلاوے چنانچہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ تشریف لے چلیے تھوڑا شوربا نوش فرمالیجئے آپ نے فرمایا کہ عائشہ بھی چلیں گی اُسوقت تک حجاب نازل نہ ہوا تھا۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی ہماری دعوت کرے اور ہم قبول دعوت میں کوئی شرط لگالیں تو اس بناء پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھئی ہمارا ایک مہمان بھی ہے اور جیسے ہم کو شرط لگانے کا اختیار ہے اسیطرح داعی کو بھی اختیار ہے کہ خواہ وہ ہماری شرط کو منظور کرے یا نہ کرے اس صورت میں جبر نہیں ہے اس لئے یہ جائز ہے تو آپ نے فرمایا عائشہ بھی۔ گو اُس شخص کا پہلے سے حضرت عائشہ کی دعوت کا ارادہ نہ تھا

مگر اب حضور کے فرمانے سے ارادہ کر سکتا تھا۔ مگر اُس نے اپنے ارادہ کو چھپایا نہیں صاف کہہ دیا کہ نہیں حضرت عائیشہ کی دعوت نہیں۔ اس سے حضور کی تعلیم کا اندازہ کیجئے کہ آپ کے یہاں آزادی کی تعلیم اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ حضور فرماتے ہیں عائشہ بھی اور وہ کہتا ہے نہیں عائشہ نہیں آپ نے صحابہ کو اتنا آزاد بنایا تھا کہ وہ جان دینے کو تو ہر دم تیار مگر کھانا دینے کو ہر وقت تیار نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری کی تو یہ حالت تھی جیسا کہ ایک صحابی فرماتے ہیں۔ ؎

	فان ابی و والدتی و عرضی	+	لعرض محمد منکم وقاء	

مگر اس کی ساتھ ہی وہ امور اختیاریہ میں بے تکلف بھی اس درجہ تھے کہ آپ حضرت عائیشہ کی دعوت کو شرط بتاتے ہیں وہ نہیں مانتا آخر آپ نے فرمایا کہ عائیشہ نہیں تو ہم بھی نہیں اُس نے کہا نہ سہی اور چلدیا آج تو کوئی مرید اپنے پیر کے ساتھ ایسا کرے۔ دیکھئے پھر کیا ہوتا ہی بجائے مرید کے اُس کا لقب مرتد ہو جائے گا۔ مگر اس سے تو اُس کی اور ترقی ہو گئی۔ کہ نیچے کے نقطے اوپر آگئے اور پھر دال بھی مشدد ہے کیونکہ اصل میں دو دال ہیں ایک کا دوسرے میں ادغام ہو گیا مرید کے تو چار ہی حرف تھے اور یہاں پانچ حرف ہو گئے گو حساب ابجد میں پانچ حرف نہیں مانے جائیں گے کیونکہ اُس کا قاعدہ اور ہے وہاں حرف ملفوظی کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ مکتوبی کو دیکھا جاتا ہے۔ غرض یہ تو اور احسان ہوا پیر کا کہ مرید کی ترقی کر دی۔ مگر میں مرشد کو مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے مرید کو مرتد تو نہ کہو بلکہ ایسا ہی غصہ نکالنا چاہو تو مَرید ہی کہلو بفتح المیم کہ پہلے تو میم کو رفع تھا جو رفعت کی علامت تھی اور اب نصب ہو گیا مشقت کے معنی میں ہے غرض آجکل کوئی ایسا معاملہ کرے تو مرشد صاحب اس کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول کریں مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کس کا حق ہو گا ہمیں تو اپنے واسطے آپ کو نمونہ بنانا چاہئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص پھر لوٹا کہ حضور تھوڑا سا شوربا نوش فرمایئے آپ نے فرمایا کہ اور عائشہ بھی اُس نے پھر یہی کہا کہ نہیں عائیشہ نہیں۔ حقیقت میں حضور نے اپنے غلاموں کو کس قدر بے تکلف بنا دیا تھا میں مرشدوں اور اُستادوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو ایسا ہی بے تکلف رکھو مگر تو کروں کو نہیں کیونکہ

اگر اُسے گستاخ کر لیا تو وہ آقا کو پریشان کرے گا مگر اتنا ذلیل بھی نہیں کرنا چاہئے جیسا آجکل کیا جاتا ہے کہ بارہ بجے باہر رہو جب گھنٹی بجاویں تب آؤ یہ صاف کبر ہے اور نہایت بُری بات ہے ممکن ہے کہ کسیوقت وہ ہماری جگہ ہو جاوے تو سوچ لیجئے کہ اگر آپ کی ساتھ یہ معاملہ کیا جائے تو آپ کو کس قدر ناگوار ہو شاید تم یہ کہو کہ ایسا ہونا تو بعید ہے اجی اتنا سا انقلاب خدا کو کیا مشکل ہے جب سلطنتیں بدل جاتی ہیں تو ایک غریب کا امیر ہو جانا اور ایک امیر کا غریب ہو جانا کیا بعید ہے۔ چنانچہ اس قسم کی بہت حکایتیں ہیں اُنہیں سے ایک حکایت بہت مشہور ہے کہ جو بوستاں میں لکھی ہے ایک تونگر کے یہاں ایک فقیر آیا اُس نے سوال کیا اُسے نکال دیا۔ پھر اتفاق سے تونگر پر افلاس آگیا اور ایسی مصیبت پڑی کہ بیوی تک کو طلاق دینا پڑی اور اب بھیک کی نوبت پہونچ گئی۔ اتفاق سے یہ کسی جگہ پہونچا وہاں جا کر سوال کیا صاحب خانہ نے اپنی عورت سے کہا کہ سائل کو کچھ دے آؤ عورت نے جو سائل کو دیکھا تو زار زار رونے لگی اُس نے رونے کا سبب پوچھا تو اُس نے کہا کہ یہ میرا پہلا شوہر تھا ایک مرتبہ ہم میاں بی بی بیٹھے تھے کہ ایک سائل آیا اُس کو اس نے بہت سختی سے جھڑک دیا اُسی کے وبال میں یہ گرفتار ہوا۔ اُس نے کہا وہ سائل میں ہی تھا۔ دیکھئے کیسا انقلاب ہوا کہ سائل مسئول ہو گیا اور مسئول سائل اور پھر دولت تو دولت بیوی تک اُس کے قبضہ میں پہونچ گئی۔ خدا کی قدرت ہے اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہوا تو کیا آخرت میں بھی کچھ نہ ہوگا۔ غرض نوکر کی نہ اتنی تحقیر کرو جو خدا کو بُری لگے اور نہ اُس سے اتنی بے تکلفی کرو کہ گستاخ ہو جائے بہرحال گستاخ تو نہ کیجئے مگر شفقت کے ساتھ رکھئے غرض اعتدال کی رعایت ضروری ہے میرے ایک دوست ڈپٹی کلکٹر تھے وہ اپنے نوکر کو کھانا تک ساتھ کھلاتے تھے میں نے اُنھیں اس سے منع کیا اُنھوں نے نہ مانا آخر میں اُس کی گستاخی اتنی بڑھ گئی کہ اُنھیں علیحدہ کرنا پڑا۔ اسیطرح مرید اور شاگرد کو پیر اور اُستاد تو مثل اولاد کے سمجھے اور مرید اور شاگرد اپنے کو غلام سمجھے۔ بہرحال ہمیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سبق لینا چاہئے وہ شخص پھر تیسری بار آیا کہ چلکے تھوڑا سا شوربا نوش فرمائیے آپ نے پھر فرمایا کہ عائشہ بھی اُس نے کہا اچھا عائشہ بھی۔ پھر دونوں حضرات تشریف لے گئے۔ اور شاید اس پر کسی کو

شبہ جبر کا ہو کہ حضرت عائشہ نے تو اس شخص کے یہاں بلا طیب خاطر کھایا تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اب اُس کی رائے بدل گئی۔ پہلے یہ خیال تھا کہ شوربا ہے ایک آدمی بھر کا اور اُس کا یہہ جی چاہتا تھا کہ حضورؐ سیر ہو کر کھاویں مگر اُس نے جب دیکھا کہ حضور ہی آدھا پیٹ کھانا چاہتے ہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے تو اب اُس میں حضرت عائشہ کے لئے کراہت نہیں رہی پس اس حدیث کو پہلی حدیث کے ساتھ ملا کر دیکھئے کہ حضور نے جو گھر پر جا کر صحابی سے پوچھا کہ اگر اجازت ہو تو یہ آوے ورنہ نہیں یہ کس صورت اور کس حالت میں تھا۔ حضور نے اُس وقت پوچھا تھا جب کہ آپ نے صحابہ کو اپنی ساتھ اتنا بے تکلف بنا دیا تھا کہ اجنبی تو اجنبی وہ تو حضرت عائشہ کے باب میں بھی صاف صاف عرض کر سکتے تھے اب بتائیے کہ آپ نے بھی اپنے دوستوں کو اتنا بے تکلف کیا ہے حضور نے تو اتنا بے تکلف کر رکھا تھا کہ میزبان کو یقین تھا کہ وہ اگر اجازت بھی نہ دے گا۔ تب بھی حضور ویسے ہی بشاش رہیں گے۔ جیسے اجازت کے بعد ہوئے سو حضورؐ تو اتنی رعایت فرماتے تھے کہ کسیکو تنگدلی نہ ہو تو ہم کو کیا حق ہے کہ ہم کسی پر جبر کر کے چندہ لیں چاہے اُس کا دل چاہے یا نہ چاہے۔ محققین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی سائل قرائن سے جانتا ہے کہ اگر کسی سے مجمع میں سوال کرے گا۔ تو وہ ایک روپیہ دے گا اور اگر یہی سائل تنہائی میں سوال کرتا تو وہ آٹھ آنہ دیتا اس صورت میں سائل کو آٹھ آنہ سے زیادہ حلال نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجمع کا لحاظ ہوتا ہے اور شرم ہوتی ہے اس لئے ایسی حالت میں مجمع میں مانگنا بھی جائز نہیں۔ تو حضرت جبر تلوار دکھانے کو نہیں کہتے۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جسم کو اذیت پہونچا کر لینا حرام ہے اسیطرح قلب کو اذیت پہونچا کر اور بوجھ ڈال کر لینا بھی حرام ہے۔ بلکہ دل تو بدن سے بھی زیادہ نازک ہے اس واسطے چندوں میں اہل وحاجت کو درمیان میں نہ ڈالیں بلکہ خود تحریک کریں اور تحریک بھی عام کرنا چاہئے یہ نہیں کہ فہرست لے کے اُس کے پاس پہونچ گئے اُس نے دس روپیہ لکھے تو اُس سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شان تو پچاس روپیہ کے قابل ہے اُس نے شرما شرمی بیس روپیہ کر دئے ایک عذر کا جواب تو یہ تھا جو خوش دلی کی شرط کے متعلق کیا جاتا تھا کہ ہم نے صاف کہدیا تھا کہ خوشی ہو دو نہ ہو نہ دو اس تقریر سے اُسکی

اُس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ دوسرا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم کچھ اپنے واسطے تھوڑا ہی کرتے ہیں ہم تو اللہ کے واسطے کرتے ہیں تو اگر جبر بھی ہو تو کیا ہے یہ عجیب عذر ہے اسکا تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ کیواسطے جبر جائز ہے تو بتلائیے اللہ تعالیٰ نے کہاں کہا ہے کہ جبر کے لئے ڈکیتی کرو اگر یہی مسئلہ ہے تو آج تو یوں چندہ وصول کیا کل کو چوری بھی کروگے اور کہدوگے کہ اپنے واسطے تھوڑا ہی کی ہے ہم نے تو مسجد کے لئے کی ہے۔ اور عدالت میں بھی جاکے یہی عذر کر دینا دیکھیں عدالت کیسے چھوڑ دے گی۔ اسیطرح عدالت عالیہ کو سمجھنے بلکہ غور کیا جاوے تو اس میں ایک اور باریک بات ہے وہ یہ کہ اگر اپنے نفس کے واسطے جبر کرتے تو اتنا بُرا نہ ہوتا جتنا اللہ کے واسطے کرنا بُرا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس کام کی غرض نہ حاصل ہو وہ بے کار ہوتا ہے اب سوچو کہ اگر نفس کے واسطے کسی سے وصول کرتے اور غرض یہ ہوتی کہ تم کو دنیا کا نفع ہو تو جبر کی صورت میں یہ مقصود تو حاصل ہو جاتا اور اگر خدا کے واسطے جبر کیا جس میں غرض یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ خوش ہوں تو اس میں تو وہ مقصود بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ جبر سے الٹا گناہ ہوا تو اور زیادہ بُرا ہوا۔ غرض اپنے نفس کے لئے جبر کرتے تو کچھ فائدہ تو حاصل ہوتا کہ روپیہ جیب میں آتا اور خدا کے واسطے ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کیا تو خدا تعالیٰ بھی ناراض ہوئے اور کیا تھا خوش کرنے کو اب تو یہ فعل محض لغو اور بیہودہ ہوا تو یہ دوسرا عذر تو بالکل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگیا یہ تو ایسا ہی ہوگیا جیسے ایک شخص نے ایک آدمی کو طمانچہ لگایا وہ ناراض ہوا تو آپ کہتے ہیں معاف کیجئے میں آپ کے ابا جان کو سمجھا تھا سبحان اللہ یہ عذر بڑا اچھا ہوا تو یہ کہنا کہ ہم دین کے واسطے کرتے ہیں اپنے واسطے نہیں کرتے ایسا ہی عذر گناہ بدتر از گناہ ہوا تو خدا کے واسطے کام کرتے ہیں تو اور زیادہ احتیاط چاہئے بہرحال ایسی ہی چندہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ۔ اور یہاں ایک شبہ نئے مجتہدوں کی طرف سے اور بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نے تو مسلم کی قید لگائی ہے تو کافر کا مال جبراً لینے میں کیا حرج ہے کیونکہ آجکل مجتہد کثرت سے ہونے لگے ہیں پہلے تو جب کوئی علوم میں امام ابوحنیفہ کے درجہ پر پہونچتا تھا جب مجتہد ہوتا تھا اور آجکل بس ترجمۂ قرآن دیکھ لیا اور مجتہد ہوگئے اور پھر غضب تو یہ ہے کہ کافر بھی ہمارے مذہب

میں اجتہاد کرنے لگے چنانچہ میں ایک مقام پر ایک صاحب کے یہاں دعوت کی تقریب سے بلایا ہوا گیا وہ ملے نہیں نوکر سے پوچھا کہاں گئے ہیں کہا کھیلنے گئے ہیں میں حیران ہوا کہ وہ کیا بچے ہیں جو کھیلنے گئے ہیں ارے ظالمو اس کا نام تفریح ہی رکھدیا ہوتا کیونکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی بھی شایستگی سکھلائی ہے چنانچہ جی متلانے کے معنے میں اہل عرب خبثت کہا کرتے تھے جس کا ترجمہ ہے میرا جی میلا ہو رہا ہے یا خراب ہو رہا ہے آپ نے فرمایا کہ یہ نہ کہو بلکہ یوں کہو لقست نفسی جس کا ترجمہ ہے میرا جی متلاتا ہے کیونکہ خبثت نفسی میں خبث کی استاد ہے اپنے نفس کی طرف جو سننے سے برا معلوم ہوتا ہے اس واسطے ہم تو اس کھیل کے لفظ پر بھی ضرور مواخذہ کریں گے جس سے آپ بچپن میں داخل ہونا چاہتے ہیں حالانکہ پہونچ چکے ہیں پچپن میں۔ میں اُن کے انتظار میں بیٹھ گیا وہاں ایک انگریز بھی اُن سے ملنے آیا تھا۔ وہ بھی اُسی جلسہ میں بیٹھ گیا اُس نے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کیں کہنے لگا کہ اُن (قرآن) میں آیا ہے کہ طاعون ایک سے دوسرے کو لگتا ہے میں سوچتا رہا کہ اے اللہ قرآن کی کونسی آیت میں یہ مضمون ہے اتنے میں آپ نے خود ہی تفسیر کی کہ دیکھو کراُن (قرآن) میں آیا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں بھی مت جاؤ۔ اور وہاں سے بھی مت جاؤ اول تو اس ظالم نے حدیث کو قرآن بنایا۔ پھر اُس میں اپنا اجتہاد ٹھونسا اور دوسرے جزو سے اس طرح استدلال کیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے دوسری جگہ جانے کو اس لئے منع فرمایا ہے کہ دوسری جگہ جا کے طاعون پھیلاؤ گے سبحان اللہ اسکو نص کا مدلول بتلاتے ہیں غرض اجتہاد اتنا عام ہوگیا ہے کہ کافر بھی ہمارے دین میں اجتہاد کرنے لگے ہیں چنانچہ آجکل گاندھی بھی مسلمانوں کے مذہب میں مجتہد سمجھے گئے ہیں اور یہ ایسے مجتہد مصیب مطلق ہیں کہ امام ابو حنیفہ سے تو اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی چنانچہ اسی بنا پر بعض مسائل میں اُن سے رجوع ثابت ہے یا خود علماء احناف نے اُن کے بعض فتووں کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر عمل کر لیا ہے مگر گاندھی کی زبان سے کوئی غلط بات نکلتی ہی نہیں بس جو بات اُس کے منہ سے نکلی نعوذ باللہ گویا قرآن و حدیث ہاتھ باندھے اُسکی تائید کو کھڑے ہیں کہ مولویوں نے فوراً اُس کو شریعت سے ثابت کر دیا خدا خیر کرے۔ ــــہ

	اذا کان الغراب دلیل قوم		سیھدیھم طریق الھالکینا

اگر ایسے ہی مجتہد ہوئے تو وہ ضرور قوم کو تباہ کریں گے اور کر ہی دیا۔ خلاصہ یہ کہ آجکل اجتہاد کا ہے زور حتی کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدون طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا۔ لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے اور غیر مسلم اُس کے مالک ہیں خواہ اُن کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اُسے سرکاری سمجھکر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں مگر بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھکر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ حرج نہیں خواہ اُس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور نے تو مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے اس کا ایک جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث وعید میں الرجل یقتطع مال الرجل آیا ہے۔ رواہ فی الترغیب عن الحاکم وقال صحیح علی شرطہما اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسالم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے لہم ما لنا وعلیہم ما علینا البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال بنسبت مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھئی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جاویں گی تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اُس کے بھائی ہی کو ملے گا۔ خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اُسے دیدیں اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر۔ پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اُس کا بھلا کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا

اگر کوئی کہے کہ پھر اُسے نفع کیا ہوا جب نیکیاں اُس کے کارآمد نہ ہوئیں جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اُسے محسوس نہ ہوگا۔ جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چرا لیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی لیکن اس سے کوئی عادل اور کوئی عاقل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرا لیا کرو مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور کوئی یہ کہکے ملاوے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا تو کیا یہ جرم نہیں یقیناً جرم ہے اگر اطلاع ہو جائے تو ضرور سزا ہوگی مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے مگر عدم احساس سے بطلان شے تو لازم نہیں آتا اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہو گئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی گو اُسے خفت کا احساس نہ ہو۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے لا یخفف عنہم العذاب کہ اُن کے عذاب میں تخفیف نہیں کیجائے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی یہ تعارض ہوا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو باقی یہ مطلب اس آیت کا نہیں ہے کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں اور بعضے ایسے نہیں اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں یہ نہیں کہ فرعون اور شداد و نمرود کی برابر اُس کافر کو بھی عذاب ہو جو غریب مسکین مظلوم تھا تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اُس کا ضعف ہوگا اور کسیکو ضعفین اور یہ سب قرآن میں آیا ہے البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا پھر اُس سے کمی نہ ہوگی۔ اور یہ دوسرا جواب ہے یعنے مطلق خفت کی نفی نہیں ہے بلکہ عذاب مجوزین خفت کی نفی ہے بہرحال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ اب تیسرا جواب سنئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو

نقصان پہونچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کرے گا کیونکہ عام طور پر اُسوقت لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خانہ دوستان بروب و در دشمنان مکوب۔ حضورؐ نے امت کو اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانہ دوستان بروب کی بھی گنجائش نہ رہی اس کی اس لئے تصریح کر دی کہ شاید اس قول کے ظاہر پر عمل کرنے لگے مگر ایسے شخص کو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے۔ کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اُس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لے جائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے اور شیخ کے کلام میں رو فتن کا وہ درجہ مراد ہے جس کو گوارا کیا جا سکے جیسے بعض صورتیں دوستوں میں بے تکلفی کی ہوتی ہیں۔ غرض اس پر کلام بڑھ گیا تھا کہ بدون طیب خاطر کے کسی کا مال حلال نہیں ہوتا۔ اسیطرح بہنوں کا حصہ بھی حلال نہیں کیونکہ عموماً طیب خاطر سے وہ نہیں دیتیں محض رسم و رواج سے دیتی ہیں انہیں صحت ہبہ کے لئے دیانت کا بھی حکم ہے کہ اُن کے قبضہ میں رقم اور جائداد جانے کے بعد اور اُس کی آمدنی وصول کرنے اور خرچ کرنے کے بعد اگر وہ دیں تو یہ ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں اور قضاء کا حکم یہ ہے کہ وہ ہبہ کر دے حسب شرائط یا بیع کر دے محض معاف کر دیئے یا دست بردار ہونے سے اُس کی ملک زائل نہیں ہوتی۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ زبانی بیع کر لیجئے اور اختیار ہے کہ اگر دس لاکھ کا بھی حصہ ہے اور وہ دس روپیہ میں بیچدے تو معاملہ بیع کا درست ہوجائے گا اور پھر کہدے کہ میں نے زر ثمن معاف کر دیا کیونکہ بیع میں غیر مشاع ہونا ضروری نہیں۔ یہ سب کلام ملک اضطراری پر چلا تھا اور اصل مضمون یہ تھا کہ ایک درجہ تو ہماری غلامی کا یہ ہے کہ ہم بطور ملک اضطراری کے خدا کے غلام ہیں سو یہ تمہاری کوئی خوبی نہیں۔ خوبی یہ ہے کہ ہم خود چاہیں غلام بننا جیسی آسمان و زمین سے کہا گیا تھا فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا اور انھوں نے عرض کیا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ۔ یعنے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہماری اطاعت میں داخل ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں۔ قہری اطاعت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ آج آسمانوں کو توڑنا چاہیں یا زمین کو شق کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے اور جو حکم ہو گا

لا محالہ وہ واقع ہو جاوے گا یہ تو اطاعت قہریہ ہے مگر آسمان و زمین نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ تسبیح و تقدیس و اعتقاد الوہیت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اگر کوئی کہے کہ اُن میں جان تھوڑا ہی ہے جو انھوں نے یہ باتیں کیں میں کہتا ہوں آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ اُن میں جان نہیں ہے کیوں نہیں جب قرآن میں اُن کے متعلق طوع رغبت ثابت ہے تو اُس کے لوازم بھی ضرور ثابت ہیں حاصل یہ کہ معترض کے نزدیک اگر طوع و رغبت روح ہونے پر موقوف ہے تو اُن میں بھی روح ہے مگر آپ کی سی روح ہونا ضروری نہیں ہے اگر زیادہ نہیں تو اتنی ضرور ہے کہ اُن کو شعور رہے اور وہ قصد کرتے ہیں ذکر و طاعت کا اور صوفیہ نے تو صاف صاف کہا ہے کہ اُن میں روح ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔ سہ

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند		با من و تو مردہ با حق زندہ اند	

مولانا نے ایک حکایت کے ضمن میں اس کو فرمایا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ ایک بادشاہ کافر بت پرست تھا وہ اپنی رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا اور انکار پر آگ میں ڈالدیتا تھا چنانچہ ایک عورت سے بھی کہا گیا جسکی گود میں ایک شیرخوار بچہ تھا وہ سجدہ بت پر راضی نہوئی تو اُس کے بچہ کو چھین کے دہکتی ہوئی آگ کے حوض میں ڈالدیا اور کہا گیا کہ تیرا بھی یہی حشر ہوگا وہ بیچاری گھبرا گئی۔ سہ

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت		بانگ برزد طفل کانی لم امت	

قریب تھا کہ وہ بادشاہ کے خوف سے بت کے روبرو سجدہ میں گر پڑے مگر لڑکے نے آگ ہی میں سے پکارا کہ گھبرانا نہیں میں زندہ ہوں اور مزید براں یہ کہنا شروع کیا۔ سہ

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم		گرچہ در صورت میان آتشم	
اندر آ مادر ببیں برھان حق		تا ببینی عشرت خاصان حق	
اندر آ اسرار ابراہیم بیں		کو در آتش یافت وردو یاسمین	
اندر آ مادر بحق مادری		بیں کہ ایں آذر ندارد آذری	
اندر آ مادر کہ اقبال آمدست		اندر آ مادر مدہ دولت زدست	

اور پھر ترقی کر کے اوروں کو بلانا شروع کیا۔ سہ

اندر آئید اے ہمہ پروانہ وار	اندریں آتش کہ دارد صد بہار
اندر آئید اے مسلمانان ہمہ	غیر عذب دین عذابست آں ہمہ

ماں سنتے ہی فوراً آگ میں کود پڑی اور اُس نے بھی وہی کہنا شروع کیا۔ پھر تو تمام لوگ لگے آگ میں گرنے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو پولیس کے ذریعہ سے لوگوں کو آگ میں گرنے سے روکنا پڑا کہ اگر یہی حال رہا تو بادشاہ کے مذہب کا بطلان شائع ہو جائے گا پھر بادشاہ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آگ سے کوئی گزند نہیں پہونچتا تو اس حالت کو دیکھ کے بادشاہ بہت جھنجلایا اور غصہ میں فرضی خطاب کے طور پر کہا کہ اری آگ آج تجھے کیا ہو گیا تو جلاتی کیوں نہیں کہاں گئی تیری وہ تیزی اور گرمی اور کہاں گئی تیری قوت محرقہ کیا تو آگ نہیں رہی۔ حق تعالیٰ نے آگ کو زبان دی اور اُس نے جواب دیا کہ سہ

گفت آتش من ہمانم آتشم	اندر آ تو تا بہ بینی تابشم

یعنے میں تو وہی آگ ہوں تو ذرا اندر آ تو تجھے معلوم ہو کہ میں آگ ہی ہوں۔ سہ

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم	تیغ حقم ہم بدستوری برم

یعنے میری خاصیت نہیں بدلی لیکن میں خدائی تلوار ہوں اُس کی اجازت سے کاٹ سکتی ہوں تیری خواہش سے نہیں کاٹ سکتی۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آگ کو حکم ہوا کی نی بردًا وسلامًا وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اسیطرح جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو حضرت ابراہیم نے اپنا کام شروع کر دیا کہ کاٹ رہے ہیں اور چھری خوب تیز ہے مگر چھری کاٹتی نہیں یہانتک کہ حضرت ابراہیم نے غضبناک ہو کر کہا اری چھری تجھے کیا ہوا تو کاٹتی نہیں، تو وہ کہتی ہے مجھے آپ کیا فرماتے ہیں آپ کو حکم ہوا ہے کاٹنے کا۔ اور مجھے حکم ہوا ہے نہ کاٹنے کا آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کروں گی جو مجھے کہنا ہو حق تعالیٰ سے کہئے۔ اگر وہ اجازت دیدیں گے تو کاٹ دونگی۔ غرض کہ حکم الٰہی سے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بے کار رہی چھری حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر بے کار رہی۔ اس مقام پر مفسرین نے ایک علمی لطیفہ لکھا ہے کہ اگر بردًا

کے ساتھ سلامًا نہ ہوتا تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ پھر ٹھنڈک سے تکلیف ہونے لگتی اس لئے حق تعالیٰ نے صرف برد انہیں فرمایا بلکہ سلامًا بھی فرمایا تو مولانا نے اس حکایت پر متفرع کر کے فرمایا ہے۔ ؎

بادو خاک و آب و آتش بندہ اند	با من و تو مردہ با حق زندہ اند

یہ تو حکایت تاریخی سے استدلال تھا۔ آگے قصہ منصوصہ سے استدلال فرماتے ہیں۔ ؎

گر نبودے واقف از حق جان باد	فرق چوں کردے میان قوم عاد

تو حضرت یہ سب چیزیں جاندار ہیں اور سجدے ارشاد ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالدَّوَابُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ یعنے یہ سب سجدہ میں مشغول ہیں وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ سب مخلوقات کی فہرست بتلا کر کسی میں کوئی قید نہیں لگائی مگر ہمارے متعلق فرمایا۔ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ مکہ بہت سے آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں۔ ہمیں پھسڈی نکلے کہ سوائے ہمارے اور تو سب سجدہ میں ہیں اور جب ہمارا نمبر آیا تو کثیر من الناس کی قید سے فرمایا آگے دوسرے مقابل کی نسبت فرماتے ہیں وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ اور یہ ظاہر ہے کہ عبادت و سجدہ قسریہ سے کفار بھی خالی نہیں اگر یہاں عبادت قسریہ مراد ہوتی تو انسان کے ساتھ کثیر کی قید نہ ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ یہاں عبادت اختیاریہ مراد ہے پس اور مخلوقات تو سب کی سب خوشی سے عبادت میں مشغول ہیں بجز انسان کے کہ انمیں بہت سے تو خوشی سے عبادت کرتے ہیں اور بہت سے کافر ہیں جو عبادت اختیاریہ سے محروم ہیں اور جب آسمان و زمین شجر و دواب نجوم وغیرہ خوشی سے عبادت کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آسمان و زمین وغیرہ میں اتنا ادراک ہے جس سے وہ حق تعالیٰ کو پہچان تے ہیں اور یہ ادراک ان کا قیامت کے قریب سب پر ظاہر ہو گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہودیوں کو قتل کیا جاوے گا اور وہ چھپتے پھریں گے تو اگر کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو پتھر بھی کہدے گا کہ اے مسلم میرے پیچھے یہودی ہے اور پھر قیامت میں تو سب ہی بولیں گے

چنانچہ ارشاد ہے۔ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ اور ارشاد ہے يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا یعنے جس دن زمین سب اترے پتے کھولدیگی اور دہریوں نے جو اس کا انکار کیا ہے میں کہتا ہوں اُن کے پاس دلیل کیا ہے امتناع کی کچھ بھی نہیں پھر اُلٹا ہم سے پوچھتے ہیں کہ تم اس کا ثبوت لاؤ اور ثبوت بھی دلائل عقلیہ سے نہیں وہ تو ہم پیش کرچکے کہ اس کا امتناع ثابت نہیں تو امکان ثابت اور جس ممکن کے وقوع کی مخبر صادق خبر دے اُس کا وقوع ثابت بس اس ممکن کا وقوع ثابت ہوگیا تو پھر ہم سے ثبوت کیا مانگتے ہیں نظیر لاؤ تاکہ اُسے دیکھکر استبعاد رفع کریں۔ آجکل یہ بھی ایک جہل ہے کہ نظیر بتلانے کا نام ثبوت رکھا ہے حالانکہ ثبوت نام ہے دلیل عقلی یا نقلی کا اور نظیر سے تو دلیل کی توضیح مقصود ہوتی ہے نظیر سے اثبات مدعا نہیں ہوا کرتا مگر آجکل یہ اُلٹی منطق ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے ہیں چنانچہ ایک شخص رامپور میں معراج جسمانی کا انکار کرتے تھے میں نے کہا معراج جسمانی ہی تھی روحانی نہ تھی تو کہا ثبوت لاؤ میں نے دلائل بیان کئے۔ مگر وہ پھر کہتے ہیں کہ ثبوت لاؤ یعنے نظیر لاؤ کہ کسی اور کو بھی ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ نظیر اثبات مدعٰی کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ توضیح دلیل کے لئے ہوتی ہے مگر اس کو وہ سمجھتے ہی نہیں۔ سوال تو کردیا اور جواب سمجھنے کی صلاحیت نہیں اب ہم پر الزام ہے کہ علما جواب نہیں دے سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ تم جواب سمجھ ہی نہیں سکتے ورنہ جواب سے ہم کب عاجز ہیں اسیواسطے بعض دفعہ اُن سے خطاب کرنیکو دل نہیں چاہتا بقول عارف شیرازی کے۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کے نیست

غرض وہ تو بار بار یہی کہتے جاتے ہیں کہ ثبوت لاؤ یعنے نظیر لاؤ اس کا ایک اور بھی جواب ہے وہ یہ کہ اگر ہر واقعہ کے ثبوت کے لئے نظیر کی ضرورت ہے تو نظیر بھی ایک واقعہ ہے پھر اُس کے لئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ہے تو پھر اُس کے لئے بھی اسیطرح نظیر کی ضرورت ہوگی تو پھر اُسمیں بھی یہی کلام ہے۔ غرض اگر کہیں سلسلہ ختم ہوگیا تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ختم نہیں ہوا تو تسلسل لازم آئیگا جو محال ہے اور جو مستلزم محال ہے وہ بھی محال ہے مگر وہ اسے بھی نہیں سمجھتے۔ اب ثبوت میں صرف

اس کی کسر رہ گئی کہ چھت پھٹ جائے اور میں اوچک کر اُن کے سامنے اُڑ جاؤں کہ لو صاحب معراج ہو گئی۔ ایک صاحب اس پر اُلجھے تھے کہ اگر معراج جسمانی ہوئی تو ہوا کے کُرہ کے بعد آگ کا کُرہ ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہوا نہیں ہے جہاں بغیر سانس لئے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا کہ اس دعوے کی کہ بغیر سانس لئے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتے دلیل کیا ہے تو قاعدہ سے تو اتنا ہی جواب میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک بات دفعہ استبعاد کے لئے بعد میں سمجھ میں آئی کہ سیر کی دو قسمیں ہیں۔ سیر سریع اور سیر بطیئی یعنے ایک جلدی گذرنا اور ایک ٹھہر کے گذرنا سو جلدی گذرنے میں استبعاد بھی نہیں کیونکہ سرعت کے ساتھ آگ میں سے نکل جائے تو تو جل نہیں سکتا۔ جیسے ایک شعلہ ہو اُس کے اندر سے جلدی جلدی اُنگلی کو یا ہاتھ کو نکالو تو رونگٹا بھی نہیں جلے گا۔ بس اگر اسی طرح حضور بھی معراج میں اس سرعت کے ساتھ پہونچا دئے گئے کہ یہ چیزیں اثر نہ کر سکیں تو استبعاد بھی نہیں رہا۔ اسیطرح ان چیزوں کے بولنے میں امتناع عقلی تو نہیں ہے صرف استبعاد عادی ہے اور اب تو استبعاد عادی بھی نہیں کیونکہ روزانہ نئی ایجادیں نکلتی ہیں جنسے بہت سے مستبعدات کا مشاہدہ ہونے لگا یہ اللہ کی رحمت ہے کہ ایسے لوگوں سے تائید دین کا کام لیا ہے جو کافر ہیں کہ وہ نئی نئی ایجادیں کر دیں جنسے بہت سے شبہات حل ہو گئے چنانچہ لوگوں کو شبہ تھا کہ زمین کیسے بولے گی کیونکہ وہ تو جمادات میں سے ہے خدا نے اس کی نظیر گراموفون ایجاد کرا دیا کہ نہ انسان ہے نہ حیوان اور نہ نباتات اور پھر بولتا ہے اب اس کو کس قسم میں داخل کروگے جو اُس کے لئے نطق کو جائز رکھو گے۔ اس سوال پر کہ کس قسم میں داخل کروگے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک انسپکٹر تھے تعلیمات کے وہ جہاں جاتے تھے لڑکوں سے پوچھا کرتے تھے کہ موجودات کی کتنی قسمیں ہیں بتلاؤ۔ وہ کہتے کہ تین قسمیں۔ جمادات۔ نباتات۔ حیوانات۔ پھر پوچھتے کہ بتلاؤ میز کس قسم میں ہے اگر لڑکے نے اُس کو نباتات کہدیا تو وہ کہتے کہ اس میں نمو کہاں ہے اور اگر جمادات سے کہدیا تو کہا کہ یہ تو لکڑی ہے اور لکڑی درخت کی ہے اور درخت نباتات میں ہے غرض بچوں کو بہت دق کرتے تھے۔ ایک لڑکا تھا بہت ذہین اُس نے کہا کہ موجودات کی چار قسمیں ہیں۔ حیوانات۔ نباتات۔ جمادات اور متفرقات۔ بس جو چیز اُن

تین قسموں میں داخل نہ معلوم ہوئی کہدیا کہ یہ متفرقات میں سے ہے بس اس کے بعد اُن کا سوال ختم ہوگیا کہ وہ تو اُن کا بھی اُستاد نکلا۔ بس اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے موجودات میں سے کچھ چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جنکو تم متفرقات میں داخل کروگے۔ مثلاً اگر اموفون کو اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ جمادات میں سے ہے تو بولتا کیوں ہے اور اگر حیوانات میں سے ہے تو کبھی مرتا کیوں نہیں حالانکہ یہ جنکی آواز کی حکایت کرتا ہے وہ تو مرکے ختم بھی ہوگئے مگر یہ نہیں ختم ہوتا۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جمادات ہی میں سے ہے تو جمادات کے بولنے کا استبعاد بھی ختم ہوگیا۔ البتہ اب تک یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس میں مخارج کہاں ہیں اور حروف کیسے ادا ہوتے ہیں اور یہ حیرت بھی اس لئے ہے کہ ہم اُس کی حقیقت نہیں جانتے ورنہ موجدوں کو کچھ بھی حیرت نہیں اسی سے سمجھ لیجئے کہ جس نے اسکے موجد کو ایجاد کیا وہ کیسا ہوگا۔ ع

چہ باشد آن نگار خود کہ بند دایں نگارہا

اور در اصل تو گر اموفوں کو بھی موجد حقیقی نے ہی ایجاد کیا ہے گو ظاہر میں ایک انسان موجد نظر آتا ہے کیونکہ یہ ایجاد نتیجہ ہے فعل دماغ کا اور موجد کا کام صرف سوچنا تھا پھر سوچنے کے بعد ایجاد کا ذہن میں آجانا اُس کے اختیار میں نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بات اُس کے اختیار میں نہیں کہ ایجاد کی صورت چار دن میں ذہن میں آجائے یا برس روز میں اگر ایجاد کا ذہن میں آنا اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ فوراً ہی کیوں نہ سمجھ لیتا سالہا سال تک اُدھیڑ بن میں کیوں لگے رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور موجد ہے اور یہ محض واسطہ ہے۔ ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں		یار بیروں فتنہ او در جہاں	

کام کوئی کرتا ہے اور نام کسی کا ہے۔ ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگار ہیں		کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں	

اور یہ ستمگاری معنے مجازی پر محمول ہے مگر اہل ادب اس مجاز سے بچتے ہیں چنانچہ میں نے ایک مرتبہ ایک مضمون لکھا تھا اور اُسمیں یہ شعر بھی لکھا تھا تو میرے ایک بزرگ نے اس شعر

کو ادب کی بنا پر کاٹ کر اس کے بجائے دوسرا شعر لکھدیا کہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل	نسیم صبح تیری مہربانی

اور میں نے ایک شعر دوسرا لکھا تھا اُسے باقی رکھا۔ کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں	مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

یعنے مشک کے بارہ میں چینی ہرن کا نام لگا دیا ہے ورنہ یہ سب آپ ہی کی زلف کی خوشبو ہے درحقیقت صوفیہ کرام نے اسی کو سمجھ کر کہا ہے کہ مخلوقات مظہر صفات آلیہ اور محض واسطہ ہیں اور فاعل حقیقی حق تعالےٰ ہی ہیں۔ مقصود تو اتنا ہی تھا۔ باقی جوش میں بعض سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے ہیں کہ کم فہموں کے ایمان کی صفائی ہوگئی جس سے وہ ہر شے کو خدا سمجھنے لگے۔ مثلاً ؎

ز دریا موج گونا گون بر آمد	ز بیچونے بر نگ چوں بر آمد
گہے در کسوت لیلےٰ فرو شد	گہے در صورت مجنوں بر آمد

تو یہ سب غلبۂ حال میں نکلا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کبھی لیلیٰ کہدیا اور کبھی مجنوں۔ خوب سمجھ لو اور وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست اسی مسئلہ کا نام ہے اور ان تعبیرات مجازی کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی بڑے حاکم کے پاس ایک مظلوم پہونچا اور جا کر کسی کے ظلم کی فریاد کی حاکم کہتا ہے کہ پہلے پولیس میں رپوٹ لکھواؤ پھر ابتدائی عدالت میں باقاعدہ چارہ جوئی کرو وہاں تمہارے مفید نہ ہو تو درمیانی عدالت میں جاؤ وہاں بھی نہ ہو تو پھر ہائیکورٹ یا عدالت العالیہ میں رجوع کرو اور جب وہاں بھی نہ ہو تب میرے پاس لاؤ ابھی سے خلاف ضابطہ میرے پاس کیسے آگئے۔ تو وہ کہتا ہے حضور میں نہیں جانتا پولیس و عدالت میرے تو حضور ہی پولیس ہیں اور حضور ہی عدالت ابتدائی۔ اور حضور ہی عدالت انتہائی۔ اب میں پوچھتا ہوں یہ کلام صحیح ہے یا غلط بالکل صحیح ہے۔ اب ایک کم فہم جاہل نے بھی وہاں دربار میں یہ کلام سنا اور یہ سمجھا کہ اچھا یہ بادشاہ صاحب کانسٹیبل بھی ہیں کوتوال بھی ہیں تھانہ دار بھی ہیں اور اب جو دربار میں گیا تو جا کے بادشاہ سے کہا کانسٹیبل صاحب السلام علیکم اسپر اسکے اتنے جوتے لگیں گے کہ یاد کریگا کیونکہ یہ کلام بالکل غلط ہے بس یہی فیصلہ ہے۔ وحدۃ الوجود کا یہی حاصل ہے

عارفین کے ان اشعار کا مثلاً ؎

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست	یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

اور مثلاً عارف جامیؒ کا شعر جس میں اس کی بنا بھی بتلادی ؎

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی	ہر چہ پیدا میشود از دور پندارم توئی

یعنے چونکہ آپ میری جان و دل میں ہر وقت حاضر ہیں اس لئے میں ہر چیز کو یوں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی ہیں۔ پندارم سے معلوم ہو گیا کہ اس کا منشا غلبۂ خیال ہے یہ نہیں کہ واقع میں ہر چیز معاذ اللہ خدا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو جب کوئی سامنے سے آتا ہے تو یوں ہی سمجھتا ہے کہ وہی آگیا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ جب مولانا یہ شعر پڑھ رہے تھے تو ایک منکر تصوف نے کہا مولانا اگر خر پیدا شود۔ تو آپ نے فی البدیہہ یہ جواب دیا۔ پندارم توئی۔ یعنے میں سمجھوں گا کہ تو ہے۔ سبحان اللہ جواب میں بھی اس کلیہ سے نہیں نکلے اور جواب ایسا دیا کہ مخاطب پر چسپاں ہو گیا کیا ذہانت ہے۔ اس احمق نے مولانا کے ذوق کو بھی برباد کیا۔ غرض یہ ہے وحدۃ الوجود کی حقیقت اور ہمہ اوست کا عنوان ایسا ہے جیسا اُس مظلوم کا بادشاہ سے کہنا کہ حضور ہمارے تو پولیس بھی آپ ہی ہیں۔ مجسٹریٹ بھی آپ ہی اور عدالت العالیہ بھی آپ ہی ہیں۔ تو یہ قول اُس کا صحیح ہے یا غلط اگر مجاز نہ لیا جائے تو غلط ہے ورنہ صحیح ہے اس قول کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی حاکم آپ ہیں اور سب واسطہ اور برائے نام حاکم ہیں اور سب آپ کے مقابلہ میں ضعیف ہیں مطلب یہ ہے کہ آپ اقوی ہیں اور اقوی کے سامنے اضعف کچھ بھی نہیں یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ موجود حقیقی حق تعالےٰ ہیں۔ باقی سب برائے نام موجود ہیں۔ اسے سعدیؒ نے خوب واضح کیا ہے۔ ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید	خجل شد چو دریائے پہنا پدید

ایک قطرہ پانی کا ابر سے یہ دعویٰ کرتا چلا آنا مد ور۔ انا منور انا مطہر۔ کہ میں ایک کرہ کی طرح گول ہوں اور آئینہ کی طرح پاک وصاف ہوں مگر جوں ہی دریا کے قریب پہونچا تو اپنے دعوے سے شرمندہ ہو کر بے ساختہ کہتا ہے۔ ؎

کہ جائیکہ دریاست من کیستم	گر او ہست حقا کہ من نیستم

جہاں دریا ہے میں کیا چیز ہوں اُس سے تو مجھکو یہ نسبت ہے کہ اگر وہ ہست ہے تو میں نیست ہوں۔ واقع میں تو نیست نہیں مگر اُس کے مقابلہ میں گویا نیست ہوں یہ کلام تشبیہی ہے جیسے بہادری کے اظہار میں کمال مبالغہ منظور ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں زید اسد زید شیر ہے۔ اب کسی احمق نے بھی یہ سنا وہ زید کے پیچھے جا کے بیٹھا۔ ارے یہ کیا۔ کہا میں دُم دیکھتا ہوں کیونکہ تم نے کہا بھی تھا کہ زید شیر ہے احمق کہیں کا ارے یہ تو تشبیہ کے واسطے کہدیا تھا سچ مچ وہ شیر تھوڑا ہی ہے تو حضرت اگر ان عنوانات کا مدلول ایسا ہی اتخاذ ہے تو پھر سارے محاورات ہی بے کار ہو جائیں گے اسی محاورہ کے موافق من نیستم یہاں بھی کہا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ میری ہستی اتنی کمتر ہے کہ دریا کے سامنے مثل نیستی کے ہے۔ آگے مقصود کی تصریح ہے۔ ؎

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمترند	کہ با ہیبتش نام ہستی برند

یعنے مخلوقات ہست تو ہیں مگر ایسے ہست ہیں کہ اُس کے سامنے اُن کو ہست کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا حاکم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو اور بادشاہ پوچھے کہ آپ حاکم ہیں تو وہ شرما کر کہے گا کہ حضور میں حضور کے سامنے کیسے کہوں کہ حاکم ہوں اگر حقیقت کے اعتبار سے کہے کہ میں حاکم نہیں تو ناشکری کی اور اگر کہے کہ ہاں حضور میں حاکم ہوں تو ادب کے خلاف دعوے اور گستاخی ہے کہ بادشاہ کے سامنے دعوئ حکومت کرتا ہے وہاں یہی کہنا چاہئے کہ حضور کے سامنے کیسے کہوں۔ حقیقت کا انکار بھی نہ کرے اور ادب کو بھی نہ چھوڑے۔ کیونکہ جیسے دعوی مذموم ہے اسی طرح انکار حقیقت بھی قبیح ہے اور اگر ایسا ہی حقیقت سے انکار ہے تو بس پھر اگر کوئی یہ کہے کہ تم آدمی ہو تو یوں کہا کرو کہ نہیں ہم تو گدھے ہیں مگر یہ ایسی تواضع ہوگی جیسے میں ایک مرتبہ الہ آباد سے کانپور کا سفر کر رہا تھا جس گاڑی میں میں بیٹھا تھا اُس میں چند جنٹلمین مل گئے وہ سب مسلمان تھے صرف ایک شخص دوسرے مذہب کا جو منصف بھی تھا کہیں سے اُن میں ملگیا وہ بے فکرے تو تھے ہی آپس میں شعر اشعار کی چھیڑ چھاڑ کرتے جاتے تھے اتفاقاً اُن میں سے کسی نے ایک شعر جو پڑھا تو منصف

کے منہ سے نکل گیا جناب پھر تو فرمائیے. بس کم بختی آ گئی ایک نے کہا آہا آپ شاعر بھی ہیں اس نے کہا نہیں صاحب دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ ضرور شاعر ہیں یہ آپ کی تواضع ہے ورنہ شعر کا اعادہ نہ کراتے۔ تیسرے نے کہا جناب مسکین آپ کا تخلص ہے تو ایک کہتا ہے آہا تو یہ شعر بھی آپ ہی کا ہے کہ ؎

مسکین خر اگر چہ بے تمیز است	چوں بار ہمیں برد عزیز است

یہ سب تمسخر کر رہے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے جاتے تھے کہ معاف فرمائیے آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہو گی اگر چہ مجھے جانتے نہ تھے میں نے اپنے دل میں کہا کہ حضور آپ کی یہی بڑی عنایت ہے کہ مجھ پر مشق نہیں ہو رہی ہے۔ غرض اس کے ساتھ ان لوگوں نے بڑی شرارت کی پھر کھانا لیکے بیٹھے تو اس سے کہا مصنف صاحب آئیے. کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے ان میں سے ایک بولا گوہ موت کیسا تم کھانے کی بے ادبی کرتے ہو اس نے جواب دیا یہ تواضع ہے اپنے کھانے کو کھانا کہنا کبر ہے اس لئے اپنے کھانے کو تحقیر ہی کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تو کیا آپ اس کو بھی تواضع کہیں گے یہ تو صریح ناشکری ہے۔ اگر بادشاہ نے کہا کہ تم حاکم ہو تو یہاں دو شخصوں کی دو حالتیں ہیں۔ ایک شخص تو اس قدر مرعوب ہے اور اس پر اس قدر اثر ہے سلطان کی عظمت کا کہ فانی فی السلطان ہے وہ اگر کہدے کہ میں حاکم نہیں تو کچھ حرج نہیں اور ایک ایسا مغلوب نہیں ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ میں حاکم نہیں ہوں تو اس کہنے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو حکومت سے الگ کر دے گا کہ یہ بڑا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے عنایت کر کے حاکم بنایا اور یہ ہماری عنایت کو مٹاتا ہے اسیطرح وحدۃ الوجود میں سمجھنے کہ اگر اس پر غلبہ ہے موجود مطلق کا اور اس وقت یہ کہتا ہے کہ ہمارا وجود نہیں تو مقبول ہے ورنہ مردود غرض حال مقبول اور قال محض غیر مقبول اسیکو کہا گیا ہے ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائے	واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

تو جن صوفیہ پر غلبہ تھا حال کا انھوں نے سب کی نفی کر دی وہ یوں بھی کہہ سکیں گے۔ کہ گراموفون وغیرہ کو اس مشہور موجد نے ایجاد نہیں کیا بلکہ اس نے ایجاد کیا جسنے پہلے دماغ میں ڈالا پھر اس کے بیان کرنیکے لئے زبان میں حرکت دی پھر اس کے بنانیکے لئے ہاتھ میں حرکت دی جسکی

سامنے موجد کی یہ حالت ہے۔ ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست	میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

توجسکی حقیقت پر نظر پہونچ گئی اُسے تو یہ کہتے ہوئے شرم ہی آوے گی کہ یہ کام میں نے کیا وہ اگر نفی کر دے تو معذور ہے اب یہاں ایک سخت اشکال ہے کہ اگر حقیقت کے اعتبار سے افعال عبد کی بالکل نفی کر دیں تو عام لوگوں پر مفسدہ کا اندیشہ ہے کہ وہ گناہ کر کے بھی اپنے کو بے خطا سمجھیں گے اور اگر ہر فعل کو اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیں تو چونکہ ہر شخص اس درجہ کا ہے نہیں جس نزدیک عارفین ہیں تو اس اجازت میں مفسدہ ہے خود بینی کا کہ اتنے بڑے قادر کے سامنے یوں کہیں کہ ہم نے یہ کام کیا جس میں اپنے کاموں پر صریح ناز ہے اس اشکال کا حل جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حق تعالیٰ نے ایسی ترکیب سے فرمایا ہے جس کے بعد اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ	باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اور وہ ترکیب یہ ہے کہ ارشاد فرمایا۔ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّی فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ ؕ جس کا حاصل یہ ہوا کہ یوں کہو کہ کام تو ہم نے کیا مگر خدا کے چاہنے سے کیا اب دونوں شقوں کے مفاسد برطرف ہو گئے سبحان اللہ کتنا لطیف جمع ہے دونوں شقوں کا کہ نہ تو دعویٰ ہے اور نہ اپنا تبریہ پس اشکال بھی رفع ہو گیا یہ سب کلام اس پر چلا تھا۔ کہ آسمان و زمین نے بھی اختیاری غلامی اختیار کی تھی۔ اسی مسئلہ میں دوسرے مضامین آگئے تھے اب میں اُسی مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اوپر یہ شبہ تھا کہ کیا آسمان و زمین میں ادراک بھی ہے اُس کا جواب یہ دیا تھا کہ ہاں ادراک ہے چنانچہ قَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ سے تو استدلال گذر چکا ہے اور لیجئے ارشاد ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَہَا وَاَشْفَقْنَ مِنْہَا وَحَمَلَہَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَہُوْلًا ؕ

ترجمہ۔ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے اُس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اُس کو اٹھا لیا۔ وہ انسان بہت ظلوم جہول ہے۔ اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے۔ ڈر تو

فعل قلب کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے باقی وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ کی کیا وجہ تھی وہ وجہ یہ تھی کہ ان حضرت کو عقل بھی زیادہ تھی۔ اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا ملکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مابہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔ چنانچہ جب میں کانپور میں پڑھاتا تھا تو معقولات بھی پڑھاتا تھا اُس وقت میں نے کہا تھا کہ اہل معقول انسان کی حقیقت حیوان ناطق بتلاتے ہیں لیکن میرے نزدیک حیوان عاشق کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ فصل ایسا ہونا چاہئے جو دوسری انواع سے ممیز ہو۔ تو نطق تو انسان کے لئے اتنا ممیز نہیں جتنا عاشق کیونکہ یہ تو ملائکہ اور جنات میں بھی مشترک ہے اور عشق کا مادہ بجز انسان کے کسی میں نہیں یہ مادۂ عشق ہی تو تھا جس سے امانت پیش ہونے کے واسطے جو اس سے خطاب کیا گیا اُس خطاب میں ایسا خاص حظ اور کچھ ایسی عجیب لذت ہوئی کہ فوراً لینے کے لئے مستعد ہو گیا کیونکہ اس میں عشق بھی تھا اور عقل بھی عشق سے تو لذت خطاب کا ادراک ہوا۔ اور یہ سوچا کہ ایک بار کے کلام میں جب ایسا حظ ہوا تو حمل امانت سے تو بار بار کے کلام کا موقع ملے گا اُس میں کتنا حظ ہوگا۔ بس امانت یعنے احکام شرعیہ کی تکلیف کو قبول کر لیا گو اس کا انجام یہ بھی ہوا کہ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ۔ الی آخرہ۔ مگر عشق کی وجہ سے اسکی پروانہ کی کہ عذاب بھی بھگتنا پڑے گا اس کو لے ہی لیا حافظ شیرازی کے کلام میں اسی علت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید	قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اس شعر میں یہی واقعہ مذکور ہے اور دیوانہ کے لفظ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ امانت لینے کا سبب عشق ہوا۔ یہ مضمون حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ کا استطراداً آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ سموات وارض وجبال نے جو امانت لینے سے عذر کیا اور ڈر گئے اس سے اُن کا بھی ذی شعور وذی روح وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے پس سوال جو ان کے ادراک کے استبعاد پر ہوا تھا۔ وہ حل ہو گیا اور اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ سے انکار اختیاری غلامی کو اختیار کرنا ثابت ہو گیا۔ اور ان کے خطاب میں جو طوعاً وکرہاً واقع ہے اُس میں اسی عبدیت اختیاری وعبدیت اضطراری

کی طرف اشارہ ہے۔ جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے حاصل یہ کہ ایک غلامی تو اضطراری ہے جیسے موت بیماری وغیرہ کہ اس میں اگر اطاعت کی تو کیا کمال کیا اگر نہ کرتے تو کیا کر لیتے۔ کمال تو اُس بندگی میں ہے جو آپ کے اختیار سے ہو اور یہ غلامی اختیاری ہے اور انسان اسی کا مکلف ہے سو صورت کے درجہ میں تو ہم لوگ اس عبادت اختیاریہ کو ضروری سمجھتے ہیں مگر حقیقت کے درجہ میں ہمیں اس کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے اس لئے میں اس عبادت یعنی غلامی کی حقیقت بتلاتا ہوں اس کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ آیا ہم اس درجہ کی غلامی کر بھی رہے ہیں یا نہیں سو اس کی سہل نظیر سمجھنے کے لئے یہ ہے۔ کہ آپ کا کوئی نوکر ہو اور وہ آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو آپ نے خدا کے ساتھ کر رکھا ہے تو اُس وقت آپ کی کیا حالت ہوگی بس اسی پر فیصلہ ہے۔ اب بتلائیے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا حکم ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ نماز پڑھو اگر نوکر سے کہیں کھانا لاؤ اور وہ نہ لاوے تو آپ کو کتنا غصہ آوے گا یقیناً اُسی دن نوکری سے الگ کر دو گے۔ حق تعالیٰ کو تو اپنے بندوں کی نافرمانی پر اتنا غصہ آتا بھی نہیں جتنا ہم کو نوکروں پر آتا ہے کیونکہ انھیں محبت بھی ہے اس لئے وہ بہت سے گناہوں پر انتقام نہیں لیتے اور کبھی لیتے بھی ہیں تو بہت مہلت دیکر مگر انھیں حق تو ہے فوراً انتقام لینے کا۔ پھر آپ کے نوکر نے آپ کی نافرمانی کی تو بتلائیے اُس نے آپ کا کیا حق ضائع کیا کچھ بھی نہیں کیونکہ عقد اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب منافع ہوتے ہیں اور ایک جانب روپیہ نوکر اپنے منافع آپ کے ہاتھ بیچتا ہے منافع یہ کہ کھانا پکانا بازار جانا سودا لانا نوکر رکھنے کے معنے یہ ہوئے کہ آپ نے اُس کے منافع خریدے۔ اب آپ کے غصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنے منافع ہم کو نہیں دئے اس کا بدلہ یہ ہے کہ آپ اس منفعت کی برابر اس کو تنخواہ نہ دیجئے مگر نہیں اس پر بس نہیں کرتے سزا بھی دیتے ہیں ذلت کے ساتھ نکال بھی دیتے ہیں اور پھر وہ منافع مملوک بھی کیسے ہیں کہ جب چاہے وہ نوکری چھوڑ دے بس آپ کی ملک ختم اور یہاں تو منافع بھی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ہاتھ پیر بھی انھیں کے دئے ہوئے ہائے افسوس ہم انھیں کی چیزوں سے اُنھیں کی معصیت کرتے ہیں اسی طرح آنکھیں بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں جنکو معصیت کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح اُن کا نور بھی۔ کیونکہ

دماغ میں ایک مجمع النور ہے جو ایک نور کی نہر ہے اور ہر وقت جاری ہے۔ اور اس میں اس قدر نور پیدا ہوتا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور برابر آنکھوں میں آتا رہتا ہے اور جوں جوں آپ نگاہ کرتے اور دیکھتے ہیں وہ ختم ہوتا جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا رہتا ہے۔ جیسے پانی کی نہر یا بجلی کی روشنی کہ برابر بجلی آتی رہتی ہے۔ اسیطرح نور بھی کہ اگر کسی دن دماغ سے نہ آوے تو آنکھیں پٹ ہو جاویں اس پر ایک ملحد کو تنبہ کیا گیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ ۞ بتلاؤ اگر پانی نیچے اتر جاوے تو کون ہے جو اسے لا سکتا ہے۔ ایک ملحد نے جب یہ آیت سنی تو آپ نے قافیہ ملایا۔ اگر چہ پھر آپ ہی کا قافیہ تنگ ہو گیا کہ تاتی بہا بالمعول والمعین اگر پانی اتر جاوے تو ہم کدال اور مزدور کی مدد سے پھر نکال لیں تو گویا آپ نے یہ جواب دیا اللہ میاں کو اور وہاں تو عادت یہ ہے کہ اگر چہ دیر گیر د سخت گیر د کیونکہ وہ کوئی بے تاب تو ہوتے نہیں کہ فوراً بدلہ لے لیں۔ غرض رات ہوئی اب یہ سویا خواب میں ایک فرشتہ آیا اور اس نے منہ پر ایک تھپڑ لگایا اور کہا ذہبنا بماء عینیک فأت بہا بالمعول والمعین ۞ جیسے ہم نے تیری دونوں آنکھوں کا پانی زائل کر دیا اسے بھی مزدور لگا کے پیدا کر لے صبح اٹھا تو پٹ تھا مولانا اس مقام پر فرماتے ہیں اگر توبہ کر لیتا تو اس پر بھی معاف کر دیا جاتا اور آنکھوں کی روشنی بحال ہو جاتی مگر قساوت کب اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ اس قبول توبہ کی تائید میں ایک اور قصہ ہے کہ قارون نے جب ایک فاحشہ کو بہکایا کہ تو حضرت موسے علیہ السلام پر یہ تہمت لگانا حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دی کہ مجمع عام میں سچ کہدیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور زمین سے فرمایا کہ یا ارض خذیہ کہ اے زمین پکڑ اس قارون کو۔ چنانچہ وہ دھنسنا شروع ہوا۔ اس نے پکارا اے موسیٰ مجھے چھوڑ دو آپ نے جو شمیں پھر فرمایا یا ارض خذیہ وہ چلاتا تھا اور آپ برابر یا ارض خذیہ فرماتے تھے یہاں تک کہ بالکل دھنس گیا بعد میں حق تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ آپ اس وقت بہت غصہ میں تھے اس لئے ہم نے بھی کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ بجائے آپ کے ہم کو پکارتا تو ہم تو چھوڑ دیتے کیا انتہا ہے اس رحمت کا کہ۔ سہ

اگر خشم گیرد بکردار زشت		چو باز آمدی ماجرا در نوشت	

اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ جب میں کانپور ہی میں تھا۔ تو ایک آقا اور نوکر میں کچھ بے لطفی ہو گئی نوکر میرے پاس آیا کہ میری سفارش کو دو آقا بولے کہ اگر تم کہو تو معاف کردوں میں نے کہا میں زور نہیں دیتا۔ مگر ایک قصہ سن لیجئے۔ پھر یہ قصہ بیان کر دیا اور یہ کہا کہ آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کی بھی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھی۔ اب آپ کو اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں میں سفارش نہیں کرتا۔ بھلا خدا کی سنت کے ہوتے ہوئے موسیٰ کی سنت پر کب عمل کر سکتے تھے تو حق تعالےٰ کی ایسی رحمت تھی کہ اگر وہ ملحد اپنی گستاخی سے توبہ کرتا تو ضرور معاف کر دیتے اور اُس کی آنکھیں پھر منور کر دیتے۔ غرض آیت میں حق تعالیٰ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسباب عادیہ کو ہم اگر معطل کر دیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا اسی واسطے عارفین مشاہدہ سے کہتے ہیں۔ ؎

عقل در اسباب میدارد نظر		عشق میگوید مسبب را نگرد	

تو یہ جسقدر اسباب ہیں یہ سب اُنھیں کے عطا کئے ہوئے ہیں مگر نام ہمارا کر دیا جیسے ہم اپنے بچوں کے واسطے بعض چیزیں اُن کے خوش کرنے کے لئے نامزد کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ کھٹولی تمھاری ہے اور یہ چوکی اس کی ہے اسیطرح سب چیزیں حق تعالےٰ کی ہیں اور محض ہمارے خوش کرنے کو ہماری طرف اُن کی اسناد مجازی کر دی ہے تو اس صورت میں بڑی شرم کی بات ہے کہ اُن ہی چیزوں سے اُن ہی کا مقابلہ کریں۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ جب سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں تو ہماری ملک کیسے ہو سکتی ہیں۔ صاحبو اُس ملک کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض اسباب کے وجود پر یہ قانون مقرر کر دیا کہ اس میں فلاں شخص کو تصرف کی اجازت ہے دوسروں کو بدون اُس کے اذن کے نہیں بس یہ ہے حقیقت اس ملک کی لہٰذا اس سے ہمارے اُس دعوے میں کوئی قدح نہیں ہوا۔ اگر کوئی کہے کہ اس اسناد مجازی میں حکمت کیا ہے اگر اتنی نسبت بھی نہ ہوتی تو شاید یہ معصیت پر اتنی جرأت نہ کرتا تو میں حکمت بتلاتا ہوں اور اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی ظاہر ہو جاوے گی

جنہوں نے شریعت پر حقیقت کو ترجیح دی ہے ہیں مناقشہ تو کرتا نہیں لیکن یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حقیقت کو اگر ترجیح ہوتی شریعت پر تو بڑا لطف ہوتا کہ ہر شخص حقیقت پر عمل کرکے ایک دوسرے کی چیز لیکر بھاگ جایا کرتا کہ یہ تو اللہ میاں کی ہے تیری کہاں سے آئی۔ اور اس کا جو انجام ہوتا ظاہر ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اتنی نسبت لگا دی کہ جو چیز اسباب شرعیہ کے موافق کسیکو مل جائے وہ اسی کی ملک ہے سو اس نسبت کے لگا دینے میں تو کہ فلاں چیز فلاں کی ہے ایک ہی خطرہ ہے کہ بس اپنی ملک کا ناز ہی ہے جس کا علاج بھی آسان ہے اور وہاں حقیقت پر عمل کرنے میں قتل و خوں ریزی ہے۔

مثلاً آپ کے پاس ایک گھوڑا ہے اور آپ اسے اپنی ملک سمجھتے ہیں ایک دوسرا آدمی جو آپ سے زبردست ہو وہ کہے آپکی ملک کدھر سے ہے کہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شئے خدا ست		ایں امانت چند روزہ نزد ماست	

حقیقت کا فتوے تو یہ ہے نہیں کہ گھوڑا آپ کا ہے یہ تو شریعت کا فتویٰ ہے اور تم شریعت کو مانتے نہیں پھر یہ آپ کی زیادتی ہے کہ آپ دو برس سے غیر مملوک چیز پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اب لائیے میرا حق ہے آخر میں بھی خدا کا بندہ ہوں اس کے بعد پھر نوبت پہونچتی بچوں کی اور بیوی کی تو نتیجہ یہ ہوتا کہ عالم ایک رزم گاہ ہوتا ہر وقت قتل و خوں ریزی کا بازار گرم رہا کرتا۔ اُس وقت ہم یہ کہتے حضرت یہ سب آپ کی انکار شریعت کی بدولت ہو رہا ہے غرض اس سے تو انکار نہیں کہ عالم میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا مملوک و غلام ہے۔ مگر یہ کہنا کہ یہ فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا یہ بھی خدا ہی کا حکم و کلام ہے اگر اس کا کوئی اثر نہیں تو کیا خدا کا یہ کہنا بے کار ہے یہ راز شریعت کی عینک نے دکھلایا ہے اگر شریعت نہ ہوتی تو عالم میں ایک فساد برپا ہو جاتا مولٰنا رومی نے مثنوی میں ایک جبری کا قصہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور پھل توڑکے کھانے لگا مالک باغ نے منع کیا تو کہا تو کون ہوتا ہے باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا سو تو کون ہے منع کرنے والا اُس نے کہا اچھا اور اپنے نوکر سے کہا کہ لانو رسّا اور ختکا۔ پھر رسے سے باندھ کے خوب ہی ڈنڈے لگائے اب تو لگا چلانے اُس نے کہا کہ چلاتا کیوں ہے ارے میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رسّا بھی خدا کا اور ختکا

بھی خدا کا غرض سب خدا کا اب سمجھ میں آیا تو کہنا ہے۔ ؎

گفت توبہ کردم از جرائے عیار	اختیار ست اختیار ست اختیار	

ہاں بھئی اب تو اختیار ہی اختیار رہے تو حضرت اگر شریعت نہ ہوتی ساری عالم میں ایسا ہی ہر بونگ مچ جاتا۔ یہ تو شریعت ہی کی عنایت ہے کہ اُس نے ملک مجازی کو بھی ان احکام میں مثل ملک حقیقی ہی کے قرار دے دیا ہے ورنہ پھر تو بڑا مزہ ہوتا کہ کوئی کسیکو قتل کردیتا تو قصاص بھی نہ ہوتا۔ اور وہ کہتا کہ قاتل تو حقیقت میں اللہ میاں ہیں پھر میرا کیا دخل۔ حضرت سچ یہ ہے کہ شریعت آپ کی آپ سے زیادہ خیر خواہ ہے اگر یہ نہ ہوتی تو آپ سب حقیقت بھول جاتے مگر افسوس ہے اس پر بھی آپ شریعت کی قدر نہیں کرتے۔ غرض حق تعالی نے براہ عنایت بعض اشیاء کو ہمارے نام زد کردیا ہے مگر اس کے آثار یہ نہ ہونا چاہئے۔ کہ خدا تعالےٰ کے مقابلہ میں ان کو اپنی کہنے لگو۔ ہاں دوسرے کے مقابلہ میں اس کہنے کی اجازت ہے۔ پس اگر خدا پوچھے کہ یہ انگرکھا کس کا ہے تو کہئے آپ کا۔ اور اگر کوئی آدمی پوچھے کہ کس کا ہے تو کہئے ہمارا۔ کیونکہ اگر آپ اُس آدمی سے بھی یہی کہیں گے کہ آپ کا ہے تو وہ اتار لے گا خلاصہ یہ ہے کہ جب سب انھیں کا ہے تو انھیں کے آلات لیکے انھیں کی نافرمانی کرنا بڑے غضب کی بات ہے۔ دیکھئے اگر کوئی نوکر بچہ سا اور کمزور اور بیمار ہمارے پاس آیا ہو اور ہم نے اُسے کھلا پلا کے اور علاج کراکے تندرست اور توانا اور بڑا کیا اور پھر تلوار بندوق بھی دی۔ اب وہ اُسی تلوار بندوق سے ہمارا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاوے تو اُس سے یہی کہا جاویگا کہ میاں ہماری تلوار بندوق رکھدو اور اپنے گھر سے ہتیار لاؤ مقابلہ کے لئے اسیطرح اگر خدا کی نافرمانی کرنا ہے تو خدا کی چیزیں واپس کردو اور اپنے گھر سے لاؤ مگر جب لانا چاہو گے اُس وقت یہی کہنا پڑے گا۔ ؎

تو دادی ہمہ چیز من چیز تست	بیاوردم از خانہ چیزے نخست	

تو جس طرح آپ کو اُس نوکر کی نافرمانی ناگوار ہے اسی طرح خدا کو آپ کی نافرمانی ناگوار ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ جس کا کھاویں اُسی پر غرّاویں۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ غلامی کی حقیقت جو سمجھے گا پھر ممکن نہیں کہ اُس کے حقوق ادا نہ کرے۔ اور

حقیقت اُس کی اوپر معلوم ہو چکی ہے تو اُس کے حقوق بھی ادا کرنا لازم ہوگا۔ اور ادائے حقوق کے لئے علم حقوق شرط ہے اس لئے ضرورت ہوگی حقوق معلوم کرنے کی اب انکو اجمالاً عرض کرتا ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ وہ تین حق ہیں اُن میں سے ایک تو اطاعت ہے مگر اطاعت کے وہ معنے نہیں جو محض اہل قشر ظاہر پرست سمجھتے ہیں یعنے محض ضابطہ کی اطاعت بلکہ حقیقی اطاعت ہونا چاہئے اسے اس طرح سمجھئے کہ نوکر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو یورپین مذاق کا ہے کہ کھانا پکا دیا اور چلدیا۔ اگر آقا نے کبھی کہا بھی کہ ذرا پنکھا جھلدو کہا صاحب میرے فرائض میں نہیں ہے۔ اور ایک نوکر ایشیائی مذاق کا ہے کہ کھانا بھی پکا دیا اور کھلا بھی دیا اور پنکھا بھی جھل رہا ہے اور اس سے فارغ ہو کے بیٹھ گیا۔ آقا کے پاؤں دبانے لگا آپ کہتے بھی ہیں کہ بس بھائی جاؤ یہ کام تمھارے ذمہ نہیں ہے۔ مگر وہ کہتا ہے نہیں گو ذمہ نہ ہو مگر مجھے تو آپ کی خدمت سے راحت ہوتی ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ آپ زیادہ کس نوکر کی قدر کرینگے۔ اسی طرح خدا کے بندے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے وقت پر اطاعت کر لی پھر کچھ بھی مطلب نہیں رہا۔ نہ خدا سے محبت ہے نہ ادب ہے کوئی گناہ صغیرہ ہو گیا تو کہتے ہیں یہ تو صغیرہ ہے اور نماز روزہ کے بعد چلتے پھرتے نظر آئے نہ خدا کی یاد ہے نہ اشتیاق ہے یہ ویسی اطاعت ہے جیسے یورپین مذاق کے نوکر آپ کی خدمت کیا کرتے ہیں آپ اُس نوکر سے منقبض کیوں ہوتے ہیں جو کھانا پکا کر چل دیتا اور تھوڑی دیر پنکھا بھی نہیں جھلتا اسی لئے تو اتنے احسانات کے بعد بھی تجھے قلبی تعلق نہیں ہوا کہ ٹکا سا جواب دیدیا تو معلوم ہوا کہ آپ اپنے نوکر سے دو حقوق کے طالب ہیں ایک خدمت دوسرا تعلق قلبی تو کیا خدا کا حق اتنا بھی آپ پر نہیں جتنا آپ اپنا حق نوکر پر سمجھتے ہیں۔ مجھے اس پر ایک نوکر کی حکایت یاد آئی کہ ایک ضابطہ کا نوکر تھا کہ آقا نے جو کہدیا کر دیا اور جو نہ کہا نہ کیا بلکہ اُس میں بھی تاویل کر کے تخفیف نکال لیتا تھا۔ اُس سے آقا نے ایک بار پوچھا کہ کیا بارش ہو رہی ہے کہنے لگا ہو رہی ہے لیٹے ہی لیٹے جواب دیدیا اٹھا تک نہیں پوچھا کیسے معلوم ہوا۔ کہا ایک بلی میری چارپائی کے نیچے آئی تھی۔ میں نے اُس پر ہاتھ رکھا تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ پھر کہا میاں چراغ تو گل کر دے۔ کہا چادر سے منہ

ڈھانک لیجئے بس اندھیرا ہو جاوے گا۔ کہا اچھا ذرا دروازہ ہی بند کر دے۔ تھا ہوشیار اس میں کوئی تاویل نہیں کی۔ سمجھا کہ اس میں تاویل کرنے سے چوری ہو جانے کا اندیشہ ہے تو کیا کہتا ہے کہ جناب دو کام میں نے کئے ایک آپ کر لیجئے آخر میرا بھی تو حق ہے۔ ایک اور ضابطہ ہی کا نوکر تھا جو کام تو سب کرتا تھا مگر صرف وہی جو بتلا دیا۔ اور وہ بھی بالکل بیفکری سے اس لئے اکثر کام رہ بھی جاتے تھے۔ ایک بار مالک زیادہ ناخوش ہوا کہ تو نے یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا تو اس نے کہا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کون کام میرے ذمہ ہیں آپ مجھے سب کاموں کی ایک فہرست لکھ کر دیدیجئے۔ چنانچہ آقا نے فہرست لکھکے حوالہ کر دی۔ اتفاق سے کہیں سفر کا موقع ہوا۔ آقا گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا۔ اور نوکر صاحب پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے آقا کے کندھے پر سے دوشالہ کھسک کر زمین پر جا گرا۔ تھوڑی دور کے بعد جو دیکھا تو ندارد نوکر سے پوچھا ارے تو نے تو نہیں دیکھا۔ اس نے کہا وہ تو بہت دور پیچھے گر گیا کہا اٹھایا کیوں نہیں۔ کہا دیکھئے فہرست میں کہاں لکھا ہے کہ دوشالہ گرے تو اٹھا لینا۔ آقا نے کہا اچھا اب لکھدوں اب یہ سوچے کہ جس چیز کا نام لکھدوں گا یہ وہی اٹھائے گا اور اس کے علاوہ اگر کچھ اور گرے گا تو نہیں اٹھائے گا۔ اس لئے فہرست میں یہ لکھدیا کہ اگر کوئی چیز گر جاوے اسے اٹھا لیا کرو۔ اب جو منزل پر پہونچے تو نوکر صاحب نے ایک پوٹ کا پوٹ لاکے سامنے رکھدیا۔ پوچھا یہ کیا کہنے لگا دیکھ لیجئے۔ کہو لاتو لید ارے یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ جو چیز گر جائے اٹھا لینا۔ سو میں نے اس کو بھی اٹھا لیا تو ضابطہ کے نوکر ایسے ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ہمارا ہے خدا کے ساتھ تو کیا خدا کے ساتھ ہمارا بس ایسا ہی تعلق ہے جیسے ایک ڈپٹی کلکٹر جو بخل میں مشہور تھے کہتے تھے کہ جب خدا نے حقوق مالیہ کی فہرست بتا دی ہے تو یہ غلو ہے کہ اس سے زیادہ کا اہتمام کریں۔ اس لئے وہ زکوۃ سے ایک پیسہ زیادہ نہ دیتے تھے۔ حالانکہ ایسے ذہین لوگوں کا انتظام حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمادیا ہے کہ۔ ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ ثم تلی۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ الآیہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے استدلال کیا کیونکہ اس میں اٰتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ اول فرمایا ہے اس کے بعد اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ یعنے اتفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوٰۃ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے۔ اور زکوٰۃ دینے سے اور۔ اسیکو سمجھکر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ اس لئے ہمیں یہ حقوق سمجھکر فرائض کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہئے۔ پھر جائیکہ جن کاموں کو ضابطہ میں اور فہرست میں لکھدیا ہو اُن کو تو سب سے پہلے کرنا چاہئے۔ چنانچہ حق تعالیٰ سے محبت کرنا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا یہ تو ضابطہ ہی میں ہے بلکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تو یہاں تک فرماتے ہیں لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من مالہ وولدہ والناس اجمعین ۃ اور فرماتے ہیں من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔ یعنے جب تک میں ہر ایک کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہو جاؤں مال سے بھی اور اولاد سے بھی اور تمام لوگوں سے بھی اُس وقت تک تم میں کوئی مومن نہو گا۔ اور ایسا ہی درجہ محبت کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی۔ تو نری محبت بھی کافی نہوئی بلکہ سب محبتوں سے بڑھکر محبت فرض ہوئی۔ اب بتلایئے محبت فرض ہوگئی یا نہیں۔ یہ دوسرا حق ہے منجملہ تین حقوق کے اور تیسرا حق ادب اور تعظیم ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنی اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو بھی فرض فرمایا ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ مرجع ان ضمائر کا کلو احد ہے۔ الغرض خدا و رسول دونوں کا یہ بھی ایک حق فرض ہوا یعنے ادب و تعظیم اور اس مضمون سے تمام حدیثیں بھری ہوئی ہیں۔ بلکہ اگر غور کیجئے تو خود اسی آیت میں بھی ان حقوق کا ذکر ہے کیونکہ اطاعت تو اس کا مرادف ہی ہے اب اُس کی حقیقت دیکھو کیا ہے سو اطاعت ماخوذ ہے طوع سے اور طوع کے معنی ہیں خوشی سو اطاعت کے معنے ہوئے خوشی سے کہنا ماننا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت و عظمت کے عادتاً ممکن نہیں۔ پس اطاعت کی فرضیت کے ضمن میں محبت اور عظمت بھی فرض ہو گئی۔ اب یہاں

معنے اطاعت کے متعلق ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ وضو کو پورا کرنا باوجود ناگواری کے اعمال فاضلہ میں سے ہے۔ تو جب ناگواری کے ساتھ کیا گیا تو اطاعت نہ ہوئی پھر فضیلت کیسی اسیطرح حدیث ہے حفت الجنۃ بالمکارہ (یعنے جنت گھیر دی گئی ہے ناگوار چیزوں میں) اعمال شاقہ کو مکارہ فرمایا تو اُن میں رغبت نہوئی اور جب رغبت نہ ہوئی تو اطاعت نہوئی۔ اور اطاعت نہوئی تو جنت کی بشارت کیسے ممکن ہے تو اہل قشر اس میں اشکال کو حل نہ کرسکیں گے۔ مگر صوفیۂ کرام ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں لیکن کون سے صوفی جو صافی ہیں۔ اور کاہے سے صافی رذائل باطنہ سے اور صوفیت یہی ہے۔ کیونکہ تصوف کی تعریف ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ یعنی آباد کرنا ظاہر کا اعمال سے اور باطن کا احوال سے اعدیہ محض دعوی سے نہیں ہوتا اُس کا طریقہ تو یہ ہے۔ ؎

صوفی نشود صافی تا درم کشد جامے		بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے	

سفر سے مراد مریدوں کے گھر کا سفر نہیں کہ کبھی پونا کبھی بمبئی کبھی سورت کبھی ہندوستان پہونچ گئے۔ پختہ خبر مقدم ہے اور شود افعال ناقصہ میں سے ہے اور خامے اُس کا اسم موخر ہے یعنے جو خام ہے اُس کے پختہ ہونے کے لئے بہت سفر کی ضرورت ہے۔ اور بمبئی اور پونا کے سفر میں تو اس کے برعکس ہوگا کہ پختگی کی جگہ اور خامی ہوجائے گی۔ تو سفر سے مراد سفر سلوک ہے جس میں مختلف درجات و مراتب طے کرنا پڑتے ہیں۔ تب کہیں وہ صوفی صافی بنتا ہے اس کی تعبیر ایک دوسرے عنوان سے حافظ نے فرمائی ہے۔ ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے		ہمیں گفت ایں معما با قرینے	
کہ اے صوفی شراب انگبیں شود صاف		کہ در شیشہ بماند اربعینے	

اربعین سے مراد چلہ ہے یہ ادنی مقدار ہے سلوک کی۔ اس وقت بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اتنی مدت بھی خالص اُس کے لئے صرف کرتے ہوں۔ اب تو تصوف بہت سستا ہوگیا ہے کہ دو پیسے میں آتا ہے۔ ایک پیسہ کی تسبیح لے لی اور ایک کا گیرو منگا کے کپڑے رنگ لئے بس صوفی بن گئے اور صوفی بھی رجسٹری شدہ کہ کسی حال میں اُن کے کمال میں شبہ نہیں ہوتا۔ اگر خاموش رہے تو چپ شاہ کہلائے اور اگر اینڈی بینڈی بولے

تو اہل اسرار و اہل رموز کہلائے۔ اور اگر ٹھکانے کی کہدی تو اہل حقائق اہل معارف بن گئے غرض ہر حال میں انھیں کی جیت ہے۔ ایک ہندو کا قول ہے کہ مسلمان بڑے اچھے گھٹ گئے تو فقیر بڑھ گئے تو امیر۔ مرگئے تو پیر۔ تو صوفی سے مراد اب صوفی نہیں۔ بلکہ محقق صوفی اور قرآن و حدیث کا متبع۔ ہمارے حضرت اس قدر قرآن و حدیث کے متبع تھے کہ باوجود امام فن ہونے کے اپنے خدام علما سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کہوں اگر وہ قرآن و حدیث پر منطبق ہو تو ماننا ورنہ مجھکو خود مطلع کرنا۔ اور اگر یہ قید نہ ہو تو یوں تو بہت نکتے بیان کئے جاسکتے ہیں کیا وہ سب تصوف ہو جائیں گے۔ جیسے ایک جاہل صوفی نے تفسیر کی تھی۔ وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی اے نفس تیری یہی سجا (سزا) شاید اس کا ماخذ یہ ہو کہ لیل بھی کالی ہوتی ہے اور نفس بھی کالا ہے اس مناسبت سے لیل کے معنی نفس لے لئے اور اذا میں ہمزہ زائد آگیا ہوگا اور ذا کے معنی یہی کیونکہ اسم اشارہ ہے اور سجا معرب سزا کا۔ ایسے ہی ایک بانوا فقیر کی حکایت ہے کہ اُس نے کسی سے پوچھا کہ بتلا رزق بڑا یا محمدؐ بڑے۔ اُس شخص نے کہا کہ محمدؐ ہی بڑے ہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں۔ اور رزق مخلوق ہے۔ کہنے لگا کہ واہ تو بے پیرا ہے ارے رزق بڑا ہے دیکھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں اَنْ پہلے آیا محمدؐ پیچھے آئے۔ اَن کہتے ہیں ہندی میں اناج کو۔ خیر یہ تو محض جاہلوں کے قصے ہیں۔ بعضے وہ نکتے ہیں کہ ظاہر میں علمی ہیں۔ مگر شریعت کے خلاف ہونے سے سرمایہ ضلال ہیں۔ اسیکو مولٰنا فرماتے ہیں۔ ؎

ظالم آن قومیکہ چشمان دوختند	از سخنہا عالمے را سوختند

ہاں تو صوفیہ محققین نے اس اشکال منافاۃ کراہت و اطاعت کو حل کر دیا ہے اور دونوں کی صحیح تفسیر کر دی ہے اور کیا ہی اچھا فیصلہ کیا ہے کہ کراہت دو قسم کی ہے۔ ایک کراہت طبعی ایک کراہت عقلی تو اطاعت کے خلاف مطلق کراہت نہیں ہے۔ بلکہ صرف کراہت عقلی ہے اور وضو میں جو ناگواری ہے وہ طبعی ہے۔ اور وہ مضر نہیں کیونکہ شریعت کو رغبت و طوع مطلوب ہے جو وسع میں ہو اور وہ عقلی ہے اور کراہت طبعیہ بوجہ غیر مقدور ہونے کے شریعت کو مطلوب ہی نہیں تو اُس کا فقدان یعنے کراہت طبعی مضر بھی نہیں۔ اسے

ایک مثال سے سمجھئے مثلاً کسی کے دنبل نکل آیا وہ ڈاکٹر کے پاس گیا کہ آپریشن کردو۔ اور بے ہوشی کی دوا سنگھانے سے منع کردیا کہ اس سے دماغ کمزور ہوتا ہے اُس نے نشتر دیا اب یہ بڑے زور سے چلایا۔ اُس نے خوب زور سے دبا دبا کے مواد نکال کے مرہم لگا کے پٹی باندھ دی۔ اب یہ سنبل کے بیٹھے اوپر پچاس روپیہ اُسے انعام دیا۔ اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ اگر نشتر سے ناگواری نہ تھی تو آہ کیوں کی تھی اور اگر ناگواری تھی تو انعام کیوں دیا اس کا جواب یہی ہے کہ ناگواری تو طبعی تھی اور رغبت عقلی تھی۔ تو اسیطرح حضرات صوفیہ نے بھی اس مسئلہ کو حل کیا ہے کہ کراہت طبعیہ اور رغبت عقلیہ دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے انتقال پر روئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے پوچھا یارسول اللہ آپ بھی روتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ رحمت کا اثر ہے جو شخص بندوں پر رحمت نہیں کرتا خدا اُس پر رحمت نہیں کرتا۔ البتہ زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہئے۔ اور بعضے اولیاء متوسطین کے واقعات اُس کے خلاف ہیں کہ اُن کو لڑکے کے مرنے کی خبر ملی تو وہ ہنس دئے۔ اب اگر کسی سے دونوں واقعے بیان کردئے جائیں اور یہ نہ بتایا جاوے کہ کون کس کا واقعہ ہے اور پوچھا جائے کہ دونوں واقعہ والوں میں کون افضل ہے تو وہ تو یہی کہے گا کہ جو نہیں رویا وہ افضل ہے حالانکہ بالکل غلط۔ باقی یہ کہ اسکا کیا سبب کہ حضورؐ پر اس واقعہ کا اثر ہوا۔ اور اس متوسط ولی پر نہیں ہوا۔ سو اسے بھی ایک مثال سے سمجھئے۔ اپریشن دو آدمیوں کا ہوا۔ ایک کو دارو ئے بیہوشی سنگھائی گئی۔ اور ایک کو نہیں سنگھائی گئی کیونکہ جس کا دل زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ قوی و توانا ہوتا ہے اُسے بیہوشی کی دوا نہیں سنگھائی تو اب جسکو دارو ئے بیہوشی نہیں سنگھائی گئی تھی اُس نے تو اپریشن کے وقت زور سے آہ کی اور جو بے ہوش تھا وہ خاموش رہا۔ اسیطرح متوسطین دارو ئے بے ہوشی سونگھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ دارو مغلوب الحال ہوتا ہے اور انبیاء اور اولیاء کاملین کو نہیں سنگھائی جاتی تو اب جس نے لڑکے کے مرنے کی خبر سُنی اور وہ نہیں رویا۔ وہ حال میں اتنا مغلوب ہے کہ اُسے حس ہی نہیں الم کی۔ تو اُس کا نہ رونا کچھ بھی کمال نہیں۔ جیسے کوئی اندھا کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ کیسی ہی حسین عورت میرے سامنے سے گذر جائے

مگر میں اُسے نہیں دیکھتا تو اُس کا نہ دیکھنا کیا کمال ہے کمال اُس کا ہے جس کی آنکھیں بھی روشن ہیں اور دوربین عینک بھی لگی ہوئی ہے اور اُس کے سامنے سے حسین عورت گذرتی ہے اور وہ پروا بھی نہیں کرتا۔ ہاں حسن کا اثر بلا اختیار طبعًا اُس پر اتنا ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اور جو اندھا ہے اُس کا دل نہیں دھڑکتا۔ تو اندھا بڑا کامل نہیں ہے کیونکہ اُس نے تو دیکھا ہی نہیں۔ کمال اُس کا ہے کہ دل دھڑک رہا ہے اور علاج سکون کا یہی ہے کہ پھر دیکھ لے مگر خدا کے خوف سے نہیں دیکھتا اور کہتا ہے دیکھونگا تو غیرت خداوندی جوش میں آویگی اور کھا جاویگا۔ ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی	در بیان دعوے خود صادقی	حلال
پس چرا بر غیر افگندی نظر	این بود دعوی عشق ای بے ہنر	تو

یہاں ایک استطرادی سوال وجواب ہے۔ وہ یہ کہ شاید تم کہو کہ دعوٰے عشق ہم نے کب کیا ہے وہ کونسا دعوی ہے تو سنئے وہ دعوی یہ ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اگر کوئی کہے کہ ہم نے کلمہ تو بے شک پڑھا ہے مگر ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم عاشق بھی ہیں۔ خیر بھی ہے کہ یہی کہنا دعوی ہے عشق کا۔ کیونکہ اس کلمہ سے تم مؤمن ہوگئے اور مؤمن کے لوازم میں سے ہے عشق جس کی دلیل یہ ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ تو کلمہ کی ایسی مثال ہوئی کہ کسی نے نکاح کیا۔ اب بیوی نے کہا کہ اناج لاؤ تو کھانا پکے اُس نے کہا کہ میں یہ جھگڑا کیا جانوں میں نے تو قبلت سے تمکو قبول کیا تھا اس بکھیڑے کا نہ وہاں ذکر تھا اور نہ میں نے قبول کیا تھا۔ اب لڑائی شروع ہوگئی اور محلہ والے جمع ہوگئے تو وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں۔ ارے قبلت میں سب کچھ آگیا۔ تو بس جس طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں سب کچھ آگیا جیسا ابھی مذکور ہوا کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ لوازم ایمان سے ہے اور اشد حبًا کے معنے ہی عاشق کے ہیں کیونکہ شدت حب ہی تو عشق ہے گو خود عشق کا مادہ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر ایک جاہل صوفی نے یہ بھی دعوٰے کیا ہے کہ عشق کا مادہ بھی قرآن میں ہے پوچھا گیا کہاں ہے۔ کہا قرآن میں ہے نہیں حٰمٓ عسق۔ یہ مادہ عشق ہی کی تعبیر ہے۔ باقی یہ کہ اس میں تو سین ہے اور عشق میں شین ہے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ اصل میں تو شین ہی مراد ہے مگر حضور چونکہ پڑھے ہوئے

تھے نہیں اور اس لئے (نعوذ باللہ) آپ سے شین ادا نہ ہو سکتا تھا اس لئے آپ کی رعایت سے سین نازل کیا گیا۔ کمبخت سے کوئی پوچھے کہ اگر ایسا ہوتا تو سارے قرآن میں کہیں بھی شین نہ ہوتا۔ بہرحال یہ دعوے تو لغو اور بیہودہ ہے کہ عشق کا ذکر قرآن میں ہے محدثین تو احادیث میں بھی اس کے ذکر سے منکر ہیں اور حدیث من عشق فعف کے ثبوت میں کلام کرتے ہیں لیکن حقیقت عشق قرآن سے ضرور ثابت ہے۔ چنانچہ اشد حبًا کی تفسیر سے اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ بس تو جب آپ عاشق ہو گئے تو اب آپ سے یہ ضرور پوچھا جائیگا اگر غیر کی طرف التفات کرو گے۔ ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی		در بیان دعوی خود صادقی	
پس چرا بر غیر افگندی نظر		این بود دعوی عشق اے بے ہنر	

آپ اس کا کیا جواب دیں گے اگر کسی کی بیوی کسی غیر مرد کو تکنے لگے تو یہ دل چاہیگا کہ تلوار مار دے۔ حالانکہ یہاں تو یہ عذر بھی ممکن ہے کہ شاید یہ شخص زشت منظر ہو اور وہ جسکو تکتی ہو وہ حسین ہو مگر یہاں تو یہ عذر بھی نہیں چل سکتا۔ کیونکہ خدا سے زیادہ کون حسین ہو گا۔ اگر کوئی کہے کیا معلوم دیکھا تو ہے ہی نہیں۔ صاحبو! گو خدا تعالیٰ کو دیکھا نہیں مگر سنا تو ہے اور عشق کا مدار کچھ دیکھنے ہی پر نہیں ہے۔ ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد		بسا کیں دولت از گفتار خیزد	

اس پر بھی اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھیں گے تب ہی عاشق ہوں گے ہمارے اندر سننے کا اثر نہیں ہوتا اچھا بھئی دیکھو مگر کیا دیکھنا آنکھ ہی پر منحصر ہے ہرگز نہیں۔ اگر کوئی معاملہ پیچیدہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کام کو خوب دیکھ بھال کے کرو۔ آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ میں نے خوب دیکھ بھال لیا میرے نزدیک بالکل مناسب ہے اب میں پوچھتا ہوں آپ نے اس معاملہ کو کیونکر دیکھ لیا کیا آنکھ سے دیکھ لیا تو ذرا ہمیں بھی تو آنکھوں سے دکھاؤ اسوقت آپ یہ کہیں گے کہ ہر شے کا دیکھنا جدا ہے کسیکو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور کسیکو دل سے بس اسیطرح خدا بھی دل سے دکھائی دیتا ہے آنکھ سے نہیں دکھائی دے سکتا اگر کوئی کہے کہ اچھا دل ہی سے دکھاؤ سو بے شک تم دل سے دیکھ سکتے ہو

مگر دل پر جو پردہ پڑا ہوا ہے پہلے اُسے ہٹا دو تو پھر حق تعالیٰ سامنے ہی تو ہیں۔ ہمارے ماموں صاحب کا شعر ہے۔ ؎

کر غور ذرا دل میں کچھ جلوہ گری ہو گی	یہ شیشہ نہیں خالی دیکھ اس میں پری ہو گی

اُن سے چھوٹے ایک ماموں صاحب کا شعر ہے۔ ؎

شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردہ چشم	بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

اور اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست	تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

بتلا دیا کہ خودی اور انانیت یعنی تکبر یہ حجاب ہے اس کو دور کر دو پھر وصال ہی وصال ہے (شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

تعلق حجاب است و بیحاصلی	چو پیوند ہا بگسلی واصلی

۱۲ جامع) بس موانع کو اٹھا دو خدا سامنے ہی ہے باقی اس پردہ کے اُٹھانے کا طریقہ کیا ہے سو میں اُن طرق کو نہیں چھپاتا جن کو صوفیہ چھپاتے ہیں۔ مجھے علی الاعلان کہنے کی بزرگوں سے اجازت ہے اس لئے میں طرق رفع حجب کو ممبر پر بیٹھکر کہتا ہوں وہ رفع حجاب کا طریق یہ ہے۔ کہ توجہ الی غیر اللہ کو چھوڑ دو اگر ابتداء میں آپ کی بھی نظر حق تعالیٰ پر نہ پڑی تو اُنکی تو تم پر پڑے گی بقول کسی عاشق کے۔ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی	شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

اصل میں تو شاہ کی جگہ لفظ ماہ تھا مگر میں نے ادب کی وجہ سے شاہ کر دیا۔ پھر آپ کی توجہ اور اُنکی نظر سے آپ کے قلب کو خدا تعالیٰ سے ایک خاص تعلق ہو گا۔ بس وہی تعلق دل سے دیکھنا ہے اور یہ کرنے کی بات ہے الفاظ سے سمجھنے کی نہیں ہے۔ دیکھو اگر کوئی کابلی پوچھے کہ آم کیسا ہوتا ہے اور آپ کہیں میٹھا ہوتا ہے۔ وہ کہے گا کیسا میٹھا جیسے گڑ۔ آپ کہیں گے نہیں۔ وہ کہے گا جیسے انگور انار سیب آپ ہر ایک کی نفی کریں گے۔ وہ کہے گا پھر تعیین کے ساتھ بتلاؤ کیسا میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ الفاظ سے اُس کا مٹھاس بیان نہیں

ہو سکتا چکھکر دیکھلو۔ اور اگر آپ ہزار کوشش کریں کہ لفظوں سے اُس کو آم کی شیرینی سمجھا دیں تو وہ نہ معلوم آم کو کیا سے کیا سمجھ جائے گا۔ جیسے ایک حافظ جی نے جو آنکھوں کے بھی حافظ تھے (یعنے نابینا) کسی شخص سے جس نے کھیر کی دعوت کی تھی پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے اُس نے کہا سفید سفید ہوتی ہے۔ اُنھوں نے پوچھا سفید کسکو کہتے ہیں۔ کہا جیسے بگلا کہا بگلا کیسا ہوتا ہے۔ اُس نے ہاتھ کو بگلے کی شکل بنا کر پیش کر دیا تو آپ ٹٹول کر کہتے ہیں۔ یہ بیڑھی کھیر کیسے گلے سے اترے گی۔ یہ جو بیڑھی کھیر محاورہ میں مشہور ہے اُس کی شان ورود یہی ہے۔ تو حافظ جی نے بوسائط یہ سمجھا کہ بگلا جیسے بیڑھا ہے کھیر کی شکل بھی یہی ہوگی۔ تو دیکھئے اُس نے ذوقی چیز کو لفظوں سے سمجھانا چاہا تو نوبت کہاں پہونچی۔ بتانے والے نے غلطی یہ کی کہ امور حسیہ کو الفاظ میں ادا کیا۔ حالانکہ کھیر کی حقیقت سمجھنے کے لئے چکھنے کی ضرورت تھی اسیطرح یہ بھی کرنے کی بات ہے اور کرنے کے کام خاموشی کے ساتھ کام میں لگنے سے سمجھ میں آتے ہیں زبان چلانے سے سمجھ میں نہیں آتے بقول مولانا ؎

گرچہ تفسیر زبان روشنگر است	لیک عشق بے زباں روشن تر است

یعنے گو عشق کی تفسیر زبان سے بھی ہوتی ہے مگر حقیقت اسی تفسیر سے معلوم ہوتی ہے جو زبان بند کرکے حاصل ہوتی ہے۔ غرض رفع حجاب کا طریق ترک التفات الی الغیر ہے پھر اس ترک التفات الی الغیر کا بھی ایک طریق ہے وہ یہ کہ چند روز کسی محقق کی تعلیم کیموافق خلوت میں بیٹھ جاؤ اور جو وہ بتائے وہ کرو اس کے بعد غیر حق سے بے تعلقی اور خدا سے تعلق پیدا ہوگا اُس وقت مشاہدہ حسب استعداد ہوگا اور اس مشاہدہ سے معلوم ہوگا کہ محبت اور عشق کیا چیز ہے اور اُس وقت حقیقت وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کی منکشف ہوگی اگر کوئی کہے کہ ہم نے مجاہدہ کیا تھا اور یہ بات حاصل بھی ہوگئی تھی مگر چند روز کے بعد وہ حالت اصلیہ پھر عود کر آئی۔ تو اُس کی بقا کا طریق بھی معلوم ہونا چاہئے تو میں اس غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے کہ جذبات نفسانیہ فنا ہو جاویں۔ جیسا سائل کو شبہ ہوا۔ اور اسی بنا پر عود کا اشکال کیا۔ بلکہ اُس کا اثر صرف یہ ہے کہ وہ جذبات مغلوب ہو جاتے ہیں یعنے قبل مجاہدہ جو ہم تقاضائے نفسانی کی مقاومت کرتے تھے

تو دشوار ہوتا تھا اور بعد مجاہدہ کے وہ مقاومت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور علت اس آسانی کی وہی مجاہدہ ہے پس جب مجاہدہ میں کمی ہوگی عود ضروری ہے۔ اس لئے بقا اس کیفیت مغلوبیہ کا اس پر موقوف ہے۔ کہ مجاہدہ برابر جاری رہے اور عود کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس نے مجاہدہ کے بعد کسی دفعہ تقاضائے نفس کی مقاومت چھوڑ دی پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا پھر مقاومت نہیں کی پھر ایسا ہی ہوا پھر نہیں کی پس چند روز تک اسیطرح کرتا رہا اس سے مجاہدہ کا اثر مضمحل ہو کے زائل ہو گیا ایسا کوئی مادہ بتاؤ کہ کوئی شخص برابر مقاومت کرتا رہا ہو۔ اور پھر حالت اصلیہ عود کر آئی ہو۔ پس غلطی یہ کرتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ مجاہدہ کرکے بے فکر ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب ہمارے اندر سے رذائل نکل گئے اس کے بعد جو نفس کا تقاضا ہوا تو اُس کو رذیلہ نہیں سمجھا بلکہ کوئی اچھی حالت سمجھی۔ حالانکہ رذائل فنا تو ہوتے نہیں مجاہدہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں اس لئے بے فکری سے وہ پھر اوبھر آتے ہیں۔ اسیکو فرماتے ہیں۔ ؎

	نفس اژدرہاست او کی مردہ است		از غم بے آلتی افسردہ است

اور فنائے نفس کا جو مرتبہ مشہور ہے اُس کے یہی معنے ہیں کہ وہ مغلوب ہو گیا۔ اور تو جہ الی اللہ غالب ہو گئی لیکن اصل باقی ہے اس لئے اندر مجاہدہ کے بعد بے فکری سے عود کا ضرر اندیشہ ہے اس طریق میں بے فکری کی کہاں گنجایش یہ تو عمر بھر کا دھندا ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

	اندریں رہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے آخر بود		تادم آخر دمے فارغ مباش کہ عنایت با تو صاحب سر بود

اگر کسیکو مولانا کے دوسرے شعر سے شبہ ہو کہ مولانا تو کامیابی کے احتمال کو وقت موت تک ممتد فرماتے ہیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم لکھتے ہو کہ چالیس روز میں حاصل ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک کفایت کا درجہ ہے اور ایک نہایت کا۔ کفایت کا درجہ تو چالیس روز میں کسی محقق کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل ہو جائے گا۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ طریق کی بصیرت ہو جائے گی راہ پر لگ جاوے گا۔ اس کے بعد درجہ نہایت کا ہے جس کو مولانا فرما رہے ہیں جس کے وہ آثار ہیں جنکی نسبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

نعم العبد صہیب لو لم یخف اللہ لم یعصہ یعنے اگر صہیب کو خدا کا خوف بھی نہ ہو تب بھی نافرمانی نہ کرے یہ درجہ جب ہی حاصل ہوتا ہے جبکہ برابر مجاہدۂ نفس میں مشغول رہے جس سے کسی دن محبت ایسی راسخ ہوگی کہ خوف کی بھی ضرورت نہ رہے گی یہ نہایت ہے اس کی ایسی مثال سمجھو کہ عالم بننے کے لئے ایک درجہ تو کفایت اور ضرورت کا ہے کہ نصاب درس ختم کرلیا جائے۔ اور ایک درجہ نہایت کا ہے کہ برسوں پڑھنے پڑھانے کتب بینی کرنے سے تبحر کا درجہ حاصل ہو جائے۔ پس میرے دعوے میں جو حافظ کے کلام میں بھی منصوص ہے اور حضرت مولانا رومی کے ارشاد میں تعارض نہ رہا۔ میں اوپر یہ گفتگو کر رہا تھا کہ کراہت طبعی اطاعت کے خلاف نہیں۔ درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین اسی کے متعلق آگئے تھے۔ اب میں اسی طرف عود کرتا ہوں کہ اصل اطاعت یہی ہے کہ عقلی کراہت نہ ہو باقی طبعی کراہت نہ رہنا یہ اطاعت کا جزو یا لازم نہیں اور اسی لئے یہ حالت اکثر متوسطین کو پیش آتی ہے کیونکہ متوسطین تو اپنے حال میں اس قدر مغلوب ہوتے ہیں۔ کہ اُس وقت لذت طبعیہ اور کراہت طبعیہ کچھ بھی نہیں رہتی۔ غلبۂ کیفیت سے امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ابتدائے ذکر میں زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ اُس وقت کیفیت کا ورود غلبہ سے ہوتا ہے جس سے نفس کی کشاکشی مغلوب ہو جاتی ہے یکسوئی کامل ہوتی ہے اور یہی منشا ہے لذت کا حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی سے اُن کے ایک خادم نے شکایت کی کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسا شروع میں آتا تھا۔ مولانا نے فرمایا میاں تم نے سنا نہیں کہ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ دیکھو اگر کوئی کسی پر عاشق ہو گیا ہو پھر نکاح ہو جائے تو ہفتہ دو ہفتہ کے بعد وہ کیفیت نہیں رہے گی جو ابتدا میں تھی۔ اگر کوئی کہے کہ بس جی پھر تو جنت کا مزہ بھی مغلوب ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تو مغلوبیت کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اُس شے کے تمتع اور حسن کا احاطہ کر لیا ہے اگر یہاں بھی حسن غیر محدود ہوتا تو شوق کبھی ختم نہ ہوتا۔ یہاں وہ حسن بھی محدود ہے اور اپنی قوت بھی محدود ہے اور جنت کا حسن بھی غیر محدود ہے اور تمہاری قوت بھی غیر محدود ہوگی پھر شوق کیوں ختم ہوگا وہاں تو یہ حال ہوگا۔ ؎

یزیدك وجهہ حسنا اذا مازدتہ نظرا

اور یہی وجہ ہے کہ ذکر میں لذت نفسانیہ تو کچھ دنوں کے بعد کم ہو جاتی ہے۔ مگر شوق روحانی کم نہیں ہوتا کیونکہ روح کی قوت نفس سے زیادہ ہے۔ اور محبوب حقیقی کے کمالات حسن وغیرہ غیر متناہی ہیں تو شوق روحانی کا وہ حال ہوتا ہے جسکو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ ؎

دل آرام در بر دل آرام جو	لب از تشنگی خشک و برطرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند	کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اور ایک دوسرے عارف فرماتے ہیں۔ ؎

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز ودم درکش	حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

اور کسی نے کہا ہے۔ ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار	گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اور چونکہ جنت میں روح کی قوت یہاں سے بھی زیادہ ہوگی اس لئے وہاں یہ شوق یہاں سے بھی زیادہ ہوگا اس مقام پر بعض غیر محقق صوفیہ کو شبہ ہو گیا ہے کہ عشاق کو جنت میں بھی بے چینی رہے گی۔ مگر واقع میں یہ دعوے ہی غلط ہے کہ شوق میں ہمیشہ بے چینی ہوتی ہے۔ بے چینی جب ہوتی ہے کہ محبوب کا حصول شوق کے درجہ تک نہ ہو۔ اور وہاں جیسے شوق غیر متناہی ہوگا ایسے ہی حصول بھی غیر متناہی ہے اور ہر درجہ حصول کا اسوقت کے شوق کے موافق ہوگا پھر اس میں کیا استبعاد ہے کہ شوق موجود ہو اور بے چینی نہ ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ جس حالت میں جس قدر قرب محبوب کی استعداد ہوگی شوق بھی اُسی درجہ کا ہوگا۔ پھر استعداد میں بھی ترقی ہوگی اور اُسیقدر شوق میں بھی۔ اور بے چینی اُس وقت ہوتی ہے جب استعداد کم قرب ہو اُن کو دھوکہ ہوا ہے قیاس الغائب علے الشاہد سے کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کیا۔ بہر حال سالک کو یہ بات پیش آتی ہے، کہ ابتدا میں یہ ابن الوقت ہوتا ہے کہ حالات اس پر غالب ہوتے ہیں اور یہ اُن میں مغلوب ہوتا ہے اور انتہا میں ابوالوقت ہوتا ہے کہ حالات پر غالب ہوتا ہے۔ جیسے قرآن یاد کرنے میں ابتدا میں تو قرآن کو رٹنا پڑتا ہے اور جب یاد ہو گیا تو اب کچھ محنت نہیں

اب نہ وہ رات دن رٹتا ہے نہ سُناتا ہے۔ اس کی اس حالت کو دیکھکر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ حافظ ہے اور رٹنے والے کی حالت کو دیکھکر سب سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حافظ ہے۔ اسیطرح اولیاء کاملین کی حالت انتہا میں کسیکو معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کس درجہ کے ہیں بس ایسی حالت معلوم ہوتی ہے جیسے معمولی ناظرہ خواں ہو۔ ہاں مبتدی سلوک کی حالت سب کو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ تو مثل قرآن حفظ کرنے والے کے ہے کہ رٹ رہا ہے رات دن اور حافظ کا حال کسیکو معلوم نہیں ہوتا۔ بس رمضان آیا اور سنا دیا۔ پس جس مقام پر صبر کا امر ہے کاملین کو وہاں طبعی ناگواری ہوتی ہے اور وہ اس مقام میں صبر سے کام لیتے ہیں اور مبتدی کو غلبہ حال سے بے چینی ہی نہیں ہوتی اسلئے وہ ہنستا ہے مگر یہ کمال نہیں کمال وہی ہے کہ بے چینی بھی ہو اور پھر صبر ہو یہ اولیاء کاملین کا حال ہے اور انبیاء کی حالت اسلئے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ ادراک بھی رکھتے ہیں پھر اپنے مقامات پر غالب ہوتے ہیں اور دونوں کا فرق میں ابھی کلورا فارم کی مثال میں بتا چکا ہوں کہ ایک کلورا فارم سونگھے ہوئے ہے اسکو حس ہی نہیں الم کا۔ اور ایک ذی ہوش ہے اس کو حس ہے الم کا۔ اور باوجود احساس الم کے پھر اُف نہیں کرتا۔ بتلایئے دونوں میں کون کامل ہے۔ تو انبیاء کے مقابلہ میں اولیاء متوسطین ایسے ہی ہیں۔ اسیطرح جسکی حسین عورت پر نظر پڑ گئی اور میلان بھی ہوا مگر غیرت الٰہی کے خوف سے اُس طرف التفات نہ کیا اس کی حالت اندھے سے اکمل و بہتر ہے جس کو حسن کا ادراک ہی نہیں ہوا۔ اب حفت الجنة بالمکارہ کی حقیقت خوب منکشف ہو گئی۔ کہ جاڑہ میں صبح کی نماز کے لئے اٹھے سردی کے مارے وضو ناگوار ہے مگر محبت عقلیہ کی وجہ سے کرتا ہے تو اس میں جو شبہ اطاعت و کراہت کے تنافی کا متوہم ہوتا تھا وہ دفع ہو گیا۔ غرض ایک تو قانونی اطاعت ہے اور ایک حقیقی جس میں حق تعالیٰ کی محبت کی بھی چاشنی ہو کر مستقلاً فرض ہے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ محبت حاصل کیسے ہو اس کی بھی ایک تدبیر ہے وہ یہ ہے کہ اہل محبت کے پاس رہو اور وہ جو بتلاویں کرو۔ اور جب تک جانا میسر نہ ہو اُس وقت تک کے لئے ایک وقتی نسخہ بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ چند باتوں کا التزام کر لو۔ ایک یہ کہ کوئی معصیت اور نافرمانی نہ ہو گو اس میں کلفت ہی کیوں نہ ہو اس میں راز یہ ہے کہ جب ہم نافرمانی نہ کریں گے تو حق تعالےٰ کی نظر محبت ہم پر ہو گی اور اس سے خود بخود آپ کو حق تعالیٰ کی طرف کشش ہو گی اور گو کشش اصل میں اُدھر ہی سے ہوتی ہے۔ اور علت وصول کی یہی ہے مگر اس سے آپ کی کوشش و اجتناب عن المعصیۃ کا بیکار ہونا لازم

نہیں آتا۔ کیونکہ وہ کشش تب ہی ہوتی ہے جبکہ آپ قصد کریں اور قصد یہی ہے اور گو اس میں چند روز تکلیف ہوگی کہ ہر وقت نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی مگر پھر عادت سے سہولت ہو جاوے گی ایک بات یہ کیجئے کہ دوسرے تیسرے دن تھوڑا سا وقت نکال کے خلوت میں بیٹھ کے توجہ کیساتھ اللہ اللہ کیا کیجئے اور اس میں وساوس کے آنے کا اندیشہ نہ کیجئے۔ آپ اللہ اللہ کی طرف نگاہ کیجئے خواہ لکھا ہوا سامنے رکھئے چاہے لکھا ہوا فرض کر لیجئے۔ کہیں اس لکھے ہوئے کو دیکھ رہا ہوں اور پڑھ رہا ہوں یا ارادہ کے ساتھ ادا کیجئے محض یاد سے نہیں۔ کہ دھیان اور طرف ہو اور لفظ اللہ زبان پر ہو۔ بلکہ دل سے سوچ سوچ کے زبان پر لائیے۔ پھر اُدھر توجہ رکھنے کی حالت میں وساوس خود بخود دفع ہو جاویں گے اور اگر نہ بھی دفع ہوں تو کچھ مضر نہیں۔ اور اگر آپ یہ چاہیں کہ خطرات میں بھی حق کی ہی طرف توجہ ہو تو اس کا بھی طریقہ ہمارے حضرت قدس سرہ نے بتایا ہے کہ یہ سوچیے کہ سبحان اللہ کیا قدرت ہے حق تعالیٰ کی کہ قلب میں بھی دریا کی سی موجیں پیدا کر دیں تو پھر وہ سارے خطرات آئینہ جمال الٰہی بن جاویں گے۔ شیطان نے تو جال پھیلایا تھا حق سے دور کرنے کے لئے مگر اہل اللہ نے اس پر کیسا صیقل کر دیا کہ وہ اپنی سلیٹ کوری لیکر چلا گیا۔ اگر اب وہ دوبارہ آوے گا بھی تو لیٹ ہو کے آوے گا۔ مگر کہیں اس اطمینان پر آپ نہ لیٹ رہیں۔ اور ایک جزو یہ ہے کہ وقت مقرر کر کے تھوڑی دیر خدا کی نعمتوں کا اور اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ کیجئے۔ اور ایک یہ جزو ہے کہ کسی کامل بزرگ سے خط و کتابت رکھئے اور اپنے حالات اُسے لکھئے اور اگر کچھ حالات نہ ہوں تو یہی لکھدیجئے کہ کوئی حالت نہیں ہے اگرچہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ مفید یا مضر کوئی حالت نہ ہو۔ اور ایک جزو یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی حکایات مجاہدہ و ریاضت و ترک دنیا کی دیکھا کیجئے مگر اُن کے دقیق ملفوظات کا مطالعہ نہ کیجئے ورنہ ایمان برباد ہونے کا اندیشہ ہے مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

نکتہا چوں تیغ فولادست تیز	چوں نداری تو سپر واپس گریز

سپر سے مراد علم و فہم ہے۔ ؎

پیش ایں الماس بے اسپر میا	کز بریدن تیغ را نبود حیا

خوب ہی فرمایا ہے کہ تلوار نہیں شرماتی کاٹنے سے۔ آگے مولٰنا ان لوگوں کی خبر لیتے ہیں جو ایسے دقیق مضامین بلا ضرورت نا اہلوں کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں۔ ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند	وز سخن با عالمے را سوختند

یعنے سچی باتیں بھی جب عوام کی فہم سے بالاتر ہوں اُن کو عوام سے بیان کرنا ممنوع ہے حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں۔ یحرم النظر فی کتبنا ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہیں نہ اس لئے کہ اُن کے مضامین مفید نہیں بلکہ اس لئے کہ عوام میں استفادہ کی قابلیت نہیں۔ جیسے طبیب کسی ضعیف المعدہ سے کہے کہ بھنا ہوا گوشت کھایا کرو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ فی نفسہ مضر ہو بلکہ فی نفسہ تو وہ لذیذ و مفید ہے مگر اس کے معدہ میں اس کے ہضم کی طاقت نہیں ہے۔ اسیطرح مبتدی کو ایسی کتب کا مطالعہ مناسب نہیں۔ ہاں ایسی کتابیں دیکھے جیسے روض الریاحین ہے کہ میں نے اُس کا ترجمہ اردو میں کرا دیا ہے اور وہ چھپ بھی گیا ہے اُس میں اولیاء اللہ کی پانسو حکایتیں تھیں۔ اور پانچسو میں نے دوسری کتب سے ملا دیں اب ہزار ہو گئیں اور اُس کا نام رکھا ہے نزہتہ البساتین۔ یہہ کتاب خود بھی مطالعہ میں رکھئے اور گھر والوں کو بھی سنایا کیجئے۔ البتہ بعض حکایات اس میں بھی عامض ہیں اُن کو چھوڑ دیا کیجئے اس پر نفس پرستوں کو یہ وسوسہ ضرور ہوگا کہ اس سے تو دنیا کا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ میں کہتا ہوں خدا کی قسم اس سے تو دنیا میں پہلے سے زیادہ مزہ آنے لگیگا دیکھئے آم کی لذت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو خود آم ملا شیریں مزہ دار تو اس میں تو محض آم ہی کا مزہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ محبوب نے آپ کو مزہ دار آم دیا تو اس میں دو لطف ہیں ایک عین کا اور اضافت کا یعنے اُس کے انتساب الی المحبوب کا کہ کھاتے ہوئے اُس کا بھی مزہ لے رہے ہیں کہ یہ ہم کو محبوب نے بھیجا ہے۔ تو بتلائیے کہ اب مزہ زیادہ ہے یا پہلے زیادہ تھا۔ اسیطرح تعلق مع اللہ سے پہلے آپ گھر میں بیٹھے قورمہ کھا رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد تعلق مع اللہ کے اثر سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو محبوب کا دیا ہوا ہے تو اب جو مزہ آوے گا قورمہ میں وہ پہلے ہرگز نہ تھا۔ پہلے صرف قورمہ ہی تھا اور اب محبوب کا دیا ہوا قورمہ ہے

تو بتلایئے لطف بڑھے گا یا کم ہوگا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ محبان حق کو خود دنیا میں بھی جو لطف حاصل ہے دنیادار اس لطف سے محروم ہیں کیونکہ اُنھیں اس انتساب کا لطف میسر نہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُنکو خود قورمہ کا بھی لطف حاصل نہیں کیونکہ وہ جس ظرف میں کھا رہے ہیں اس میں مٹی پڑی ہوئی ہے جس سے سارا قورمہ کرکرا ہو رہا ہے وہ ظرف ذہن ہے اور مٹی کدورات و تشویشات و تفکرات دنیا ہیں کہ فلانے نے دعوے کر دیا ہے۔ یا فلانے کے ذمہ اتنا روپیہ ہے دیکھئے وصول بھی ہو یا نہ ہو۔ اہل اللہ کے پیالہ میں یہ مٹی نہیں ہے وہاں تو خالص قورمہ ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ اہل اللہ کو حوادث و تفکرات پیش نہیں آتے پیش آتے ہیں۔ مگر آپ میں اور اُن میں حوادث کی حالت میں بھی فرق ہے وہ یہ کہ آپ حوادث کے متعلق تجویز و رائے رکھتے ہیں کہ اس طرح ہونا چاہئے اور وہ اختیار میں نہیں اس سے سخت پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں اور اہل اللہ اپنی تجویز میں تمام تر مشیت الٰہی میں فنا کر دیتے ہیں اور اُن کا مذہب یہ ہو گیا ہے کہ۔

ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکو است

اور یہ مذہب ہے کہ۔ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من	دل فدائے یار دل رنجان من

باقی یہ کہ یہ مذہب اُن کا کیسے ہو جاتا ہے سو اس طرح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے محبوب کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اُن کا حال بن گیا ہے تو اب اُن کی کلفت کی ایسی مثال ہے جیسے محبوب کسی عاشق کو پیچھے سے آکر اپنی آغوش میں زور سے دبالے تو جب تک اُس نے محبوب کو دیکھا نہیں اُس وقت تک تو جھنجلاتا ہے کہ یہ کون مجھے دبانے لگا مگر پھر جو دیکھا کہ محبوب دبا رہا ہے تو اب یہ حالت ہے کہ پہلے سے زیادہ دبانے کی تمنا کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور تیرا رقیب چاہتا ہے کہ مجھے دبالو تو میں اُس کو دبالوں تو اُس وقت وہ عاشق کہتا ہے۔ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت	سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے کہ اُنھیں تکالیف دینا تو کیسا ناگوار ہوتیں اُنکو تو موت

بھی ناگوار نہیں۔ کیونکہ وہ سب ایسی ذات کا تصرف ہے جو اُن کا دل ربا ہے اس لئے یہ حالت ہے کہ بچہ بھی بیمار ہے مگر جیسی سوچ ان اہل دنیا کو ہوتی ہے کہ ہائے مر گیا تو کیا ہوگا وہاں کچھ بھی نہیں اور اس تمامتر پریشانی و رنج کی جڑ یہ تجویز ہی ہے اور جب تجویز ہی نہ کرے تو رنج کیسا اس لئے کہتا ہوں کہ آپ کے پیالہ میں قورمہ کا بھی لطف مفقود ہے سو ایک تو آپ کا قورمہ ہے کہ اُس میں مٹی ملی ہوئی ہے اور ایک اہل اللہ کا قورمہ ہے کہ بالکل صاف ہے کوئی کہے اہل اللہ کا قورمہ کیسا۔ کیا اہل اللہ بھی قورمہ کھاتے ہیں کیوں کیا ہوا کیا قورمہ کھانا حرام ہے۔ بعض لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ کو لذائذ حرام ہیں جیسے ایک شخص نے میری نسبت اعتراضاً کہا تھا کہ کپڑا اچھا پہنتا ہے اسی طرح لوگوں نے اہل اللہ کی نسبت سوچ رکھا ہے کہ بس یہ سوکھی روٹیاں کھاویں تو اہل اللہ ہیں ورنہ نہیں ہیں یہ غلط ہے۔ ہاں اہل اللہ کو قورمہ کی فکر نہیں ہوتی اُن کے سامنے جو نعمت بھی آجاوے وہ قورمہ ہی ہے اور جو قورمہ بھی آجاوے وہ اُس کو نعمت سمجھکر کھاتے ہیں لذت نفس کے لئے نہیں کھاتے تو اُنھیں ایک تو قورمہ کا لطف دوسرے انتساب الی المحبوب کا۔ اور تیسرے یہ کہ وہ کر کرا نہیں ہے۔ کیونکہ نہ وہاں مقدمہ کی فکر ہے نہ پیٹے کا غم اور اس سب کی وجہ وہی محبت اور محبت واقع میں ایسی ہی چیز ہے۔ ع

از محبت تلخہا شیریں شود

حقیقت میں شاہی زندگی اہل اللہ ہی کی ہے اسیکو فرماتے ہیں۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ یعنے عمل صالح کی جزا محض اُدھار ہی نہیں ہے جیسا عوام کا خیال ہے بلکہ اس کی ایک جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور وہ حیات طیبہ ہے کہ جس میں کوئی غم و فکر نہیں ہے کسی نے حضرت بہلول دانا سے پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ کہا کیا پوچھتے ہو۔ اُس شخص کا مزاج کہ دنیا میں کوئی کام اُس کی خواہش کے خلاف نہ ہو۔ اُس نے پوچھا یہ کیسے فرمایا دنیا میں جو کام ہوتا ہے یہ تو مسلم ہے کہ وہ خدا کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا اور میں نے اپنے ارادہ کو اُن کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے تو جب وہ خدا کے ارادہ کے موافق ہے

تو میری بھی خواہش کے مطابق ہوا۔ حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جو معاصر ہیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں جب ارواح کو جمع کیا گیا تو ہر ایک سے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو تو جو جس کی سمجھ میں آیا وہ اُس نے مانگا۔ جب اس ناچیز کی نوبت آئی اور پوچھا گیا کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا اریدان لا اریدو اختار ان لا اختار۔ یعنے میں یہی تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں اور یہی چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں فاعطانی ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر ای من اھل ھذا العصر۔ پس مجھے وہ چیزیں عطا ہوئیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں اُن کا وسوسہ ہی آیا اس زمانہ والوں سے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا رتبہ حضرت غوث اعظم سے بھی بڑھا ہوا ہو ممکن ہے کہ اکثر اہل عصر مراد ہوں اور ایک حیثیت سے یہ بڑھے ہوئے ہوں اور ایک حیثیت سے وہ اس بارہ میں کوئی نص تو ہے نہیں جو کسی ایک شق کا جزم کیا جاوے اور یہی فیصلہ اُن صحابہ کے بارہ میں بھی ہے جنکی افضلیت مطلقہ منصوص نہیں ہے۔ اسیطرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کہ آپ تو علی الاطلاق سب سے افضل ہیں۔ باقی انبیاء کے تفاضل میں بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایک فضیلت کے اعتبار سے ایک افضل ہوں اور دوسری فضیلت کے اعتبار سے دوسرے۔ تو دیکھئے فنا کا ارادہ کیا چیز ہے کہ اتنی بڑی دولت اس کی بدولت ملی۔ ایک منطقی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ جب عدم ارادہ کا ارادہ کیا تو یہ بھی ایک ارادہ ہے تو ارادہ پایا گیا پھر عدم ارادہ کا حکم کیسے صحیح ہوا مگر یہ لوگ غادم الفاظ ہوتے ہیں اور صوفیہ اہل معانی ہیں ابن عطا نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ وہ مطلق ارادہ کے فنا کا دعوے نہیں کرتے بلکہ اُس ارادہ کے فنا کو کہتے ہیں جو مزاحم رضاء حق ہو اور عدم ارادہ کا ارادہ مزاحم ارادۂ حق نہیں تو اُس کے ارادہ کی نفی نہیں کرتے معترض تو منہ دیکھ کے رہ گیا ہوگا۔ یہ معقولی لوگ ہمیشہ لفظوں ہی کے گورکھ دھندے میں رہتے ہیں پھر اپنے کو اہل معانی کہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مشہور اور لغو اشکال ہے کلامی ہذا کاذب ہیں کہ ہذا کا مشار الیہ یہی کلام ہو تو یہ کلام صادق ہے یا کاذب اور پھر اس پر بڑی بڑی بحثوں میں وقت ضائع کیا ہے مگر اے اللہ محارہ میں کسی نے بھی یہ جملہ آجتک استعمال کیا ہے

بس ایک صورت اپنی طرف سے گھڑلی اور اشکال کیا جاوے اس کا وقوع ہو یا نہ ہو۔ انہیں صوفیہ تو کیا منہ لگاتے عوام بھی نہیں پوچھتے۔ چنانچہ ایک منطقی طالب علم کسی تیلی کی دوکان پر گئے تیل خریدنے اُس کے بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی دیکھکر پوچھا کہ یہ کیوں باندھی ہے اُس نے کہا اس لئے تاکہ گھنٹی کی آواز سے یہ معلوم ہو جائے کہ بیل چل رہا ہے آپ نے کہا آواز سے تو بیل کا چلنا لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ کھڑے کھڑے گردن ہلایا کرے۔ اُس نے کہا جی ہاں یہ تو سچ ہے مگر میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ہے آپ میرے بیل کو بگاڑنے آئے ہیں مہربانی کرکے تشریف لے جائیے۔ یہ قدر کی منطقی صاحب کی اُس تیلی نے۔ تو غرض فنائے ارادہ صوفیہ کا ایک خاص مشرب ہے کہ اُس کے بعد وہ ہر حال میں خوش ہیں ہاں الم طبعی رضائے عقلی کے خلاف نہیں تو کیا اچھا نسخہ ہے محبت الٰہیہ جس سے دنیا بھی لذیذ اور دین بھی کامل یہ تو اہل محبت کی جماعت ہے کہ مزے لوٹ رہے ہیں۔ ایک جماعت منکرین کی ہے کہ اُن کو مزہ تو کیا نصیب ہوتا خود وجود محبت ہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت الٰہیہ کے کوئی معنے ہی نہیں کیونکہ بے دیکھے محبت ہو نہیں سکتی۔ اور حق تعالیٰ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا مگر اس شخص نے نہایت بے حسی سے کام لیا ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ ہم لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا اور نہ اپنے کانوں سے آپ کی باتیں سنیں۔ اور پھر آپ کی محبت مسلمانوں کے دل میں کس قدر ہے کہ جان دینے کو تیار رہیں تو محبت رویت ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہاں محبت کی بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جو دیکھنے پر موقوف ہیں۔ لیکن عقلی محبت تو کسیطرح بھی اس پر موقوف نہیں۔ مثلاً ہم لوگوں کو حضرت امام ابوحنیفہ سے بوجہ اُن کے کمالات فقہیہ و عبادت و ورع کے خاص محبت ہے اگر کسیطرح سے آپ کو دیکھ لیں اور یہ معلوم ہو جاوے کہ آپ حسین نہیں ہیں تو کیا یہ محبت گھٹیگی ہرگز نہیں۔ کیونکہ ہمیں جو محبت ہے وہ تو آپ کے کمالات سے ہے اور اُس کا ادراک بصر پر موقوف نہیں۔ تو پھر خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت میں کیا استبعاد رہا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس کا نام ہے محبت حسن وہ بھی دراصل کمال ہی کی محبت ہے کیونکہ حسن بھی

ایک کمال ہے اور اگر کمال سے قطع نظر حسن ہی کو بالذات موثر فی المحبت کہا جاوے تب بھی اگر زیادہ غور کیا جائے تو جس حسین کی بھی محبت ہو وہ واقع میں حق تعالےٰ ہی کی ہے۔ اب میں منکرین محبت حق پر احتجاج کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حسن وجمال جس محبوب کی صفت ہے وہ اُس کی صفت بالذات ہے یا بالعرض اگر بالذات ہے۔ تو زائل کیوں ہوتی ہے۔ چار دن بخار آیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ ذرا سی چیچک نکل آئی اور معلوم ہوا کہ مرغ نے گوبر میں ٹھونگیں ماردی ہیں اور اسی لئے صفت کی زوال کیساتھ خود محبت بھی رخصت ہو جاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار	عشق را با حی وبا قیوم وار
عشق ہائے کزپئے رنگے بود	عشق نبود عاقبت ننگے بود
غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں	عشق ہائے اولین و آخریں

اور جب یہ مجازی حسن وجمال صفت بالذات نہیں بالعرض ہے تو اُس کے لئے مابالذات کی ضرورت ہوگی اور تم جس کو مابالذات بتاؤگے اگر وہ فانی وحادث ہے تو بھی کلام اُس میں برابر ہوتا رہے گا یہاں تک کہ منتہا ہوگا حق تعالےٰ پر اِلَى اللّٰہِ تَصِيرُ الۡاُمُوۡرُ اور چونکہ ہے کمالات مقصودہ سے اس لئے مرجعیت کی صورت اتصاف بالذات ہوگا تو معلوم ہوا کہ حسن وجمال بھی اصل صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے مگر کہیں اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ صفت خدا تعالیٰ کی صفت اسی ہیئت سے ہے جس ہیئت سے مخلوق میں ظاہر ہے ہرگز نہیں ہرگز نہیں بلکہ بلا تشبیہ اس کی ایسی ناتمام مثال ہے۔ جیسے آفتاب نکلا اور اُس کی کرن کسی آئینہ میں سُرخ اور کسی میں سبز معلوم ہونے لگی تو کیا آپ آفتاب کو سُرخ وسبز کہنے لگیں گے ہرگز نہیں آفتاب کی شعاع کا رنگ تو ایک ہی ہے مگر خصوصیت محل کی وجہ سے یہ فرق ہو گیا۔ اسیطرح حق تعالیٰ کا حسن تو واحد ہے اور اس کی کوئی مثال بھی بیان نہیں کی جا سکتی مگر اس کی شعاعیں مختلف محلوں میں مختلف نظر آتی ہیں اور ناتمام اس لئے کہا کہ مشبہ بہ میں تو حقیقت شعاع کی اور اس کے تعلق بآئینہ کی حقیقت معلوم ہے اور مشبہ میں نہ صفت حق کی حقیقت معلوم نہ اُس کے وجہ تعلق

بالمظاہر کی۔ مگر جو مقصود ہے تشبیہ سے وہ ظاہر ہے اور وہ مقصود یہ ہے کہ جب عشق حسن پر ہوتا ہے اور وہ اصل میں صفت حق تعالیٰ کی ہے تو وہ درحقیقت حق تعالےٰ ہی کے حسن کا عشق ہے کسی نے اس مضمون کو نا تمام تعبیر کیا ہے۔ ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ	پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ
پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسماں	در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

اور ایک حسن ہی کیا۔ تمام صفات کمال کا یہی حال ہے کہ انسان کا علم فضل عطا جود حسن وغیرہ تمام صفات کمال میں حق تعالیٰ ہی متصف بالذات ہیں۔ پس اگر حسن کی یا اور کسی کمال کی وجہ سے کوئی کسی پر عاشق ہے تو وہ درحقیقت حضرت حق ہی کا عاشق ہے مگر اسے خبر نہیں۔ جیسے دیوار پر آفتاب کی روشنی دیکھ کے کوئی دیوار کا عاشق ہوا۔ تو وہ درحقیقت آفتاب کا عاشق ہے دیوار کا عاشق نہیں مگر اُسے آفتاب کی خبر نہیں۔ اب جو آفتاب غروب ہونے لگا اور روشنی چلی تو چلاتا ہے کہ ہائے میرا محبوب چلا اور اگر اُسکو حقیقت معلوم ہو جاتی تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔ کیونکہ غروب کے سبب صرف دیوار کے اوپر سے وہ روشنی غائب ہوئی ہے آفتاب سے تو غائب نہیں ہوئی۔ وہاں تو اب بھی موجود ہے اسیطرح علم کو صحیح کر لیا جائے تو پھر کسی محبوب مجازی کے فوت سے غم نہ ہو کیونکہ اس میں تو محبوب حقیقی کا عکس تھا۔ جب محبوب حقیقی باقی ہے تو یہ کمال بھی باقی ہے پھر رنج کاہے کا۔ پس اگر کسی سے سخاوت کی وجہ سے محبت ہے تو اب بھی وہی ذات پاک محبوب ہے۔ اور اگر علم کی وجہ سے محبت ہے تو وہ بھی وہی محبوب ہے اور حسن کیوجہ سے محبت ہے تو بھی وہی محبوب ہے اسیواسطے لا الٰہ الا اللہ کے مدلول کا ایک درجہ عارفین کے نزدیک یہ بھی ہے کہ لا مطلوب الا اللہ بلکہ لا موجود الا اللہ۔ مگر شریعت نے اس کی ساتھ حکمت کی رعایت سے اسباب کا بھی لحاظ کیا ہے۔ ورنہ لا موجود الا اللہ کی بناء پر تو بندہ کا کسی پر کچھ احسان ہی نہ ہوتا اور نہ کوئی کسی کا احسان مانتا اور اس سے تمدن برباد ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس واسطے بقائے تمدن کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ اگر کوئی احسان کرے۔ تو گو

محسن حقیقی تو حق تعالیٰ ہی ہیں اس لئے اصل شکر تو اُن کا ہونا چاہئے مگر یہ ظاہری محسن درمیان میں واسطہ تو ہے۔ اس لئے اس کا بھی شکر کرنا چاہئے پھر دیکھئے شریعت نے معاملہ بواسطہ میں بھی تعدیل فرمائی کہ یہ بنا دیا کہ مخلوق واسطہ تو ہے۔ مگر ہے اُنھیں کا بنایا ہوا اس لئے یہاں بھی انتساب الی المحبوب ہی سبب شکر و محبت کا ہونا چاہئے اور اس کو بھی مرآت جمال حق بنانا چاہئے یہ نہیں کہ اسی کا عاشق ہو جائے اور اس کو مستقل سمجھ لیا جائے اور یہاں ایک دقیقہ ہے جسے صوفیہ نے سمجھا ہے۔ وہ یہ کہ محبوبوں کی عادت ہے کہ کبھی بے حجاب ہو کے جمال دکھاتے ہیں اور کبھی باریک پردہ چہرہ پر ڈال لیتے ہیں کہ خفیف سی جھلک عاشق کو دکھلائی دے اسی عادت کے موافق سمجھو کہ جس وقت دوسرے کے واسطے سے کوئی احسان ہوتا ہے اُس وقت بھی حق تعالےٰ ہی کی تجلی ہو رہی ہے مگر چلمن کے پیچھے سے یا نقاب کے اندر سے اور اس میں بھی ایک لطیف حکمت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ناسوتی استعداد کے اقتضاء سے ایک ہی طرح کی تجلی عاشق کے جذبات محبت بھڑکانے کو کافی نہیں۔ بلکہ گوناگون تجلیات سے اس کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ اسیکو فرماتے ہیں۔ مشاھدۃ الابرار بین التجلی والاستتار۔ یہاں مقابلہ کی وجہ سے دوسری تجلی کو استتار کہا کہ اُس کے سامنے وہ استتار ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ تجلی وہ بھی ہے گو خفیف ہے تو یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ تو بلا آئینہ کے جمال دکھلاتے ہیں اور ایک مرتبہ آئینہ کے اندر سے دکھلاتے ہیں جس میں راز یہ ہے کہ انسان اُسی ناسوتی استعداد کی خاصیت سے ایک حالت سے اُکتا جاتا ہے اگر یہ استتار یا غیبت بالکل نہ ہوتی تو دوام تجلی کا لطف ہی برباد ہو جاتا۔ ؎

از دست ہجر یار شکایت نمیکنم	اگر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

تو حق تعالیٰ نے واسطہ کے ذریعہ سے سالک کا مزہ بڑھا دیا۔ اور یہاں اور توضیح کرتا ہوں کہ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جو مزے تصوف کے ہیں وہ شریعت ہی کی بدولت ہیں یہ بات بھی شریعت ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی کہ یہ وسائط مرایا جمال حق کے ہیں اُن کا بھی حق ادا کرنا چاہئے اور اس واسطہ سے بھی مشاہدہ کی لذت حاصل کرنا چاہئے

اب جو لوگ ان وسائط کو درمیان سے اڑانا چاہتے ہیں اور ہر وقت تجلی بلاواسطہ کے طالب ہیں وہ لذت مشاہدہ سے محروم ہیں۔ اسیواسطے جو لوگ کثرت سے سماع سنتے ہیں انھیں کچھ مزہ نہیں آتا کیونکہ اب وہ اون سماع کے چل ہی نہیں سکتے نہ اُن کو نماز میں لطف آتا ہے نہ ذکر میں اور بزرگوں نے جو ایسا کیا ہے اس کے لئے کچھ شرائط مقرر کر دئے ہیں اور مقصود شرائط کا یہ ہے کہ تقلیل ہو اور تقلیل سے مزہ آوے ورنہ روزی کی دال روٹی میں کیا مزہ اور اس سے یہ نہ سمجھ لیا جاوے کہ تقلیل کے ساتھ علی الاطلاق اجازت ہے۔ خود اس میں بھی شرائط ہیں۔ جنکی حکمت علاوہ تقلیل کے دوسری مضرتوں سے بچانا بھی ہے جو فاقد شرائط میں مرتب ہو جاتی ہیں۔ مقصود مقام کا یہ ہے کہ کثرت سماع میں اگر بالفرض مضرتیں بھی ہوتیں تب بھی اس لئے واجب الترک تھا کہ یہی مصلحت ہے سماع میں وہ اُس میں نہیں پائی جاتیں خیر یہ تو تفریع تھی حکمت واسطہ پر مقصود یہ کہنا ہے کہ ظاہر محسن محض واسطہ ہے باقی اصل میں سارے کمالات حقیقۃً اُنھیں کے ہیں اس لئے بندہ جس سے جس کمال کی وجہ سے بھی محبت کر رہا ہے حقیقت میں وہ اُنھیں سے محبت ہے پھر محبت حق کے حاصل کرنے کو جو طرق بتلائے جاتے ہیں اُن کی حقیقت یہ ہے کہ محبت تو اس شخص کو خدا تعالیٰ کے ساتھ پہلے سے ہے صرف اماله کی ضرورت ہے اور اس اماله کے لئے وہی دستور العمل ہے جو میں نے اوپر بتایا ہے اُسے کر لیجئے اور حیوۃ طیبہ لے لیجئے اور اُس میں ایک جزو اہل اللہ سے تعلق رکھنا بھی ہے۔ اُس کا ایک حق ضروری بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب اہل اللہ کے یہاں پہونچ جائے تو وظیفہ و مطالعہ سب کو الگ کیجئے مگر ضروریات دین کو الگ نہ کیجئے اور اب جو وہ دین اُسے لیجئے اور بالکل اُن کے یہاں ایسے ہو جائیے۔ ؎

قال را بگذار مرد حال شو	پیش مردے کاملے پامال شو

ہاں یہ شرط ہے کہ وہ مرد کامل ہو مرد کامل نہ ہو اور پھر مرد ہو مردہ نہ ہو کیونکہ مردہ تو خود ہی پامال ہو رہا ہے وہ آپ کو کیا پامال کرے گا اسیواسطے حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ؎

عالمت خفتہ دتوہم خفتہ	خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

پیر جی بنایا تو وہ بھی خفتہ اب یہ مرید کیسے بیدار ہوگا۔ اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس شعر کو رد کیا ہے کہ ؎

باطل است آنچہ مدعی گوید	خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

اس سے غرض شعر کا رد کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ظاہر شعر سے احتمال تھا کسی کے تمسک کرنے کا کہ ہمارے علما بے عمل ہیں اس لئے ہم اُن کا اتباع نہیں کرتے اس کو رد فرماتے ہیں چنانچہ شیخ کا شعر سابق اس کا قرینہ ہے۔ ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ورنبشت است پند بر دیوار

اور غرض سنائی کی نفی کرنا ہے تاثیر کا سو یہ بالکل صحیح اور مشاہد ہے اور میری غرض بھی اس کے لانے سے یہ ہے کہ صاحب تاثیر سے تعلق پیدا کرنا چاہئے کہ زیادہ نفع ہو۔ اب اس کی تحقیق باقی رہی کہ اس مرد کامل کی پہچان کیا ہے سو اس سے پہلے جلسہ میں شیخ کامل کے علامات بتا چکا ہوں اگر وہ علامات نہ ہوں گی تو پھر پیر المات ہی المات ہیں تو تم بھی المات میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہاں تک یہ سب بیان تھا معبود کے حقوق اور اُن حقوق کی تحصیل و تکمیل کے طریقہ کے متعلق۔ اب ایک مضمون جو اس کا تتمہ ہے باقی رہ گیا۔ اور وہ حقوق ہیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ اور گو اب اُس کا وقت نہیں رہا مگر دس منٹ میں اُس کے متعلق بھی کچھ کہے دیتا ہوں وہ یہ کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نائب کامل اور مظہر اتم ہیں حضرت حق کے اور اس سے زیادہ آپ کا ہم پر کیا احسان ہوگا کہ ہم کو دین ملا آپ ہی کی بدولت۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ اور اس کلیہ کے علاوہ خود مستقل حقوق بھی جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں آئے ہیں اور وہ مثل حقوق الٰہیہ کے تین ہی حق ہیں۔ اطاعت و محبت و عظمت۔ چنانچہ مختصراً و مختلطاً مع بعض فروع کے اُن کو عرض کرتا ہوں۔ مثلاً ایک نوع حق محبت کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کا دل دکھانے کی سخت ممانعت فرمائی ہے ارشاد ہے۔ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللّٰهِ الآیت

وغیرہا من الآیات۔ اس پر میں ایک تفریع کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ احادیث میں وارد ہے کہ آپ پر اُمتیوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو ہماری بداعمالیوں سے جبکہ ملائکہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہوں گے آپ کا کتنا دل دکھتا ہوگا تو اس سے کس قدر احتراز لازم ہوگا اور عظمت کے متعلق آپ کا یہ حق وارد ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اور اسی باب میں فرماتے ہیں۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ۔ آپ کے آگے چیخ کے مت بولو اور اسیطرح ارشاد ہے وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ یعنی معمولی طور سے آپ کو پکارو مت کبھی ایسا نہ ہو تمہارے اعمال غارت ہو جاویں آگے فرماتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ یعنے جو لوگ حجروں کے پیچھے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پکارتے ہیں اُن میں اکثر بے عقل ہیں۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ کچھ دیہاتی بوقت آئے تھے حضور اُس وقت زنانہ میں تشریف رکھتے تھے مگر اُنھیں یہ معلوم نہ تھا کہ کون سے قطعہ میں ہیں اُنھوں نے کہا ایک ایک آدمی ایک ایک حجرہ کے مقابل کھڑے ہو کر پکارے کہیں تو سن لیں گے۔ اس پر حق تعالیٰ نے اُنھیں آیت بالا میں ڈانٹا۔ اور اس کی یہ اصلاح فرمائی کہ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ یعنے اگر ذرا دیر اور ٹھیرے رہتے یہاں تک کہ آپ خود ہی باہر تشریف لے آتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ یعنے انھیں کیا حق ہے کہ اس طرح حضور کو پکاریں۔ اس مقام[ع] پر میں حضرات سامعین سے تفریعاً و تفریجاً ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر سے آپ کو پکارنا جائز نہیں۔ تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا میں فتوے نہیں دیتا آپ سے پوچھتا ہوں۔ یہ تو عظمت کے متعلق کچھ مضمون تھا۔ اسیطرح جیسے حق تعالےٰ کی اطاعت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے۔ اور اسیطرح جیسے حق تعالیٰ کی محبت فرض ہے ویسی ہی آپ کی

ع اس مقام کے متعلق ایک حاشیہ ہے جو وعظ کے اخیر میں ملحق ہے ملاحظہ فرما لیا جاوے۔ ۱۲ اشرفعلی

بھی فرض ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کہ جب حضور نے فرمایا کہ کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ میں اُس کے نزدیک سب سے زائد محبوب نہ ہو جاؤں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا مجھے آپ کے ساتھ سب سے زائد محبت ہے۔ بجز اپنے نفس کے تو آپ نے فرمایا کہ جب تک اپنے نفس سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ کرو گے مؤمن نہ ہو گے اُس کے بعد اُنھوں نے عرض کیا کہ اب نفس سے بھی زیادہ آپ کی محبت پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تو بس اب مؤمن بھی ہو۔ خیر اس حدیث کی ایک مشرح بھی ہے۔ جس کا اب وقت نہیں ہے۔ مگر اتنا سنا دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ حضور کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہونا چاہئے۔ اگر طبعی نہ ہو تو عقلی تو ہونا ہی چاہئے۔ اور آپ کے ان حقوق کی بجا آوری میں بھی عام کوتاہی ہو رہی ہے حتیٰ کہ جو لوگ آپ کے حقوق کو بزعم خود ادا کر رہے ہیں وہ بھی اُس کوتاہی سے بری نہیں اور وہ اس طرح کہ آپ کے جو تین حق ہیں مطاوعت۔ عظمت محبت۔ جنکا اوپر بیان ہوا ہے اُن میں اکثر لوگوں نے تجزیہ کر رکھا ہے۔ سو بعضوں نے تو صرف مطاوعت کو لے لیا ہے مگر محبت و عظمت کے حقوق کو چھوڑ دیا ہے۔ باقی بعض جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ واقع میں تو نہیں چھوڑا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے اپنی سوء فہمی سے اُسے زبردستی سے موہم گستاخی کا بنا لیا تو اُس کا ذکر نہیں اور اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ ایسے اعتراض تو لوگوں نے اللہ تعالیٰ پر بھی کئے ہیں کہ ہائے اللہ میاں قرآن میں مکھی مچھر کا ذکر کرتے ہیں جو حقیر چیزیں ہیں۔ اور یہ اللہ تعالےٰ کی شان کے خلاف ہے۔ اور بعض نے یہ کیا کہ محبت کا تو دم بھرتے ہیں مگر مطاوعت و عظمت کو بالکل ہی اڑا دیا ہے کہ نہ نماز ہے نہ روزہ نہ دین کے اور کام اور گمان یہ ہے کہ نری محبت سے نجات ہو جاویگی اور یہ شعر یاد کر لیا ہے۔ ؎

نہ ماند بعصیاں کسے در گرو ۔۔۔ کہ دارد چنیں سید پیشرو

حالانکہ اس کی ساتھ قرآن کی یہ آیت بھی ملانا چاہئے کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نفس کو اُس کے اعمال کے بدلہ میں قید حبس ہو گی۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ مومن انجیر تک محبوس عذاب نہیں رہے گا شفاعت سے کسیوقت نجات ہوجائے گی توکیا جہنم کی تھوڑی سی قید آپ کو گوارا ہے۔ صاحبو وہاں کا عذاب تحمل سے باہر ہے اس کے علاوہ میں خود دعوی محبت ہی کے متعلق کہتا ہوں کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی سے محبت ہو اور اُس کی اطاعت نہ ہو۔ ایک شخص سے محبت کا تو دعوے مگر نہ اُس سے بات کرتے ہیں نہ اُس کی طرف دیکھتے ہیں نہ اُس سے مصافحہ کرتے ہیں کسی نے کہا ارے یہ کیسی محبت ہے تو کہا ہمیں پاک محبت ہے۔ توکیا کوئی کہے گا کہ اسے محبت ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ محبت کے لئے تو لازم ہے اقتراب۔ اور یہ شخص اسباب بعد میں مبتلا ہے بلکہ از خود اُن اسباب کو اختیار کررہا ہے پھر محبت کیسی اسیطرح حضور کی محبت کا دعوے ہو اور اطاعت نہ کی جاوے تو یہ کیسی محبت ہے۔ فرض کرو ایک محب سے کسی محبوب نے کہا کہ دو روپیہ کے آم لے آؤ اُس نے کہا نہ صاحب میں تو نہ لاؤں گا۔ کیونکہ اتنی دیر تک آپ کو کیسے دیکھوں گا۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ بس معلوم ہوا۔ کہ یہ محب ہی نہیں۔ ورنہ اطاعت کرتا۔ اور فوراً چل دیتا کیونکہ محب کا تو یہ مذہب ہوتا ہے۔ ع

اُریدُ وصالہ و یُریدُ ھجری	فاترک ما اُرید لما یُرید

اُسی کا ترجمہ حضرت حافظ رح کرتے ہیں۔ ع

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق	ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

یعنے مجھے اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی کے آگے فنا کردینا چاہئے۔ اگرچہ اُس کی مرضی پر چلنے سے ظاہر العبد ہی ہوتا ہو در چہ جائیکہ اطاعت سے قرب ہی ہو چنانچہ ارشاد ہے واسجد واقترب اور حدیث میں ہے اقرب مایکون العبد حین یسجد فی الصلوۃ یعنے سب سے افضل حالت قرب کی سجدہ ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم نماز سے غافل تو یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب تو آپکو اپنے سے قریب کرنا چاہے اور آپ اُس سے دور ہونا چاہتے ہیں اسیکو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ع

تعصی الرسول وانت تظہر حبہ	ھذا لعمری فی الفعال بدیع
لوکان حبک صادقا لاطعتہ	ان المحب لمن یحب مطیع

اور بعض نے محبت اور طاعت دونوں کو اڑا دیا صرف تعظیم ہی سے لی اور وہ بھی اپنی طرف سے گھڑ کر جو واقع میں تعظیم ہی نہیں۔ اور یہ اُن لوگوں نے کیا ہے جنھوں نے آج کل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خاص طرز کی سوانح عمریاں لکھی ہیں کہ حضور میں اور آپ کے خلفاء میں اعلےٰ انتظام سلطنت کا ثابت کیا اور اپنے نزدیک آپ کی بڑی شان ظاہر کی مگر کی یہ کی ہے کہ سلطان اور ملک دونوں کی حیثیت سے تو آپ کی عظمت بتائی مگر نبی ہونے کی حیثیت سے نہیں بتائی معلوم ہوا کہ وہ آپ کی عظمت محض سلطنت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ اصل شان آپ کی نبوت ہی ہے۔ اور سلطنت تو تابع ہے اور پھر اس پر ناز بھی ہے کہ ہم نے ایسی سیرت لکھی اور ویسی لکھی اور کہتے ہیں کہ علماء کو تاریخ لکھنا نہیں آتی واقعی سچ ہے ایسی تاریخ لکھنا تو بے شک ہم کو نہیں آتی ہمارا تو یہ کام ہے۔ ؎

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم	از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

اس میں شک نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بادشاہ بھی ہیں مگر اصل صفت آپ کی نبوت ہی ہے اور سلطنت تو اس کے تابع ہے۔ یعنی وہ بھی محض اس واسطے عطا ہوئی ہے تاکہ اُس سے اغراض نبوت کی تکمیل ہو۔ ورنہ آپ کا اصل جوہر تو یہ ہے۔ کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد کہ میں اُس وقت نبی تھا کہ حضرت آدم کے جسد کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا روح بھی اُس میں نہ آئی تھی اور اسیطرح اصل کمال آپ کا یہ ہے کہ آپ خاتم ہیں سو آپ کا اصل کمال یہ ہوا کہ حضور سب سے پہلے بھی نبی ہیں اور سب کے آخر بھی کسی نے اس اولیت و آخریت میں نکتہ خوب نکالا ہے۔ ؎

؏۔ مراد اس سے محض تاریخ ہے جو کہ ان مدعیان تاریخ نویسی کا مطمح نظر ہے حتی کہ خود حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعات لکھنے میں بھی ان صاحبوں کے نزدیک یہی حیثیت مقصود ہے اور ہماری نظر جس حیثیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر ہے وہ حکایات مہر و وفا میں داخل ہے نہ تاریخ محض جو کہ قصہ سکندر و دارا سے مراد ہے۔ ظ عفی عنہ۔

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ — ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ
اے ختم رسل قرب تو معلوم شد — دیر آمدۂ زراہ دور آمدہ

واقعی نکتہ ہے عجیب و غریب کہ آپ چونکہ بہت دور سے آرہے ہیں اس لئے آنے میں اتنی دیر لگی۔ دوسرے انبیاء مسافت قریبہ سے آئے ہیں اس لئے جلدی آ گئے ان کو علمی دلیل نہ سمجھئے نناہ کے لئے لطیفہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس پر حضرات خلفاء کی فضیلت اور ترتیب کے متعلق بعض نکات یاد آ گئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ لفظ قرنی میں نکتہ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں اشارہ ہے زمانہ خلافت نبوت کی طرف کیونکہ خلفاء اربعہ کے نام کے آخری حروف اس میں بہ ترتیب آ گئے ہیں۔ یعنی صدیقؓ کا ق اور عمرؓ کی راء اور عثمانؓ کا ن اور علیؓ کی ی۔ اور ایک نکتہ اردو میں بھی کسی نے نظم کیا ہے۔ ؎

ابو بکر یکسو علی ایک جانب — خلافت کو گھیرے ہیں با صد صفائی
الف اور یے کی طرح ان کو جانو — کہ محصور ہے جنمیں ساری خدائی
یہ تشبیہ ہے واقعی تو جگہ بھی — الف اور یے نے بہ ترتیب پائی
وہ اول خلیفہ کے اول میں آیا — یہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

بھلا کوئی شعر کہے ایسے تو کہے۔ غرض بادشاہی سے اغراض نبوت کی تکمیل مقصود تھی وہ خود مقصود نہ تھی اور وہ نبوت کی غرض اصلاح خلق ہے۔ اور اصلاح خلق دو صورتوں سے ہو سکتی ہے۔ ایک حکومت سے دوسرے عقیدت سے۔ یعنے ایک تو یہ کہ بادشاہ کی عقیدت ہے کہ لوگ اُسے بزرگ اور نیک سمجھ کے بڑا مانتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ اگر نہ مانیں گے تو تلوار کے زور سے منوایا جائے گا۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب حق تعالےٰ نے اصلاح خلق کے لئے بھیجا تو دونوں قوتیں آپ میں جمع کر دیں کہ جو اہل بصیرت ہیں وہ تو عقیدت سے مانیں گے اور آپ کے کمالات ذاتیہ کو پہچانیں گے اور جو اہل بصیرت نہیں ہیں وہ تلوار کے زور سے مانیں گے کیونکہ تلوار بھی بڑا واعظ ہے ہمارے اُستاد رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے۔ ؎

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم   والسیف ابلغ وعاظ علی الفہم

کہ سب سے بڑی وعظ تو تلوار ہے یہ شعر مولٰینا محمد یعقوب صاحبؒ کا ہے اور قرآن میں اس کا ماخذ یہ آیت ہے۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معہم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید۔ اس کی تفسیر میں ہمارے مولٰینا فرمایا کرتے تھے حدید سے مراد ہے تعلدار ہونا (یعنی فیہ باس شدید کی صفت کے اعتبار سے سلاح مراد ہے) جسکی تعبیر اہل محاورہ اس عنوان سے کیا کرتے ہیں کیونکہ جو فہیم کم ہوتے ہیں ان کے لئے ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ بہرحال آپ میں نبوت کی بھی شان ہے اور سلطنت کی بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سیرت نبویہ میں حضورؐ کے کمالات سلطنت بیان نہ کئے جائیں آپ سلطنت کی شان ضرور بیان کیجئے مگر کتاب کو دو باب کیجئے ایک میں سلطنت کی شان بیان کیجئے اور ایک میں نبوت کی۔ جب نبوت کا ذکر ہی نہیں تو اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ جو دعوے ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت پہچانی۔ یہ بالکل غلط ہے آپ نے عظمت پہچانی تو مگر ادھوری اور نامکمل اسیطرح ایک صاحب نے حضرت عمرؓ کی سوانح عمری لکھی کہ اس کے دیکھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حضرت عمرؓ کی سوانح عمری ہے بلکہ اگر حضرت عمر کا نام اس میں چھپا لیا جاوے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کی پالیسی بڑے مدبر و منتظم بادشاہ کی سوانح عمری ہے کیونکہ اس میں اس کا پتہ ہی نہیں کہ آپ کا تقوی کس درجہ کا تھا۔ دین سے آپ کو کس درجہ الفت تھی۔ آپ کا زہد آپ کی ریاضت اور خلق اور شدت علی الکفار اور کرامات وغیرہ کس شان کی تھیں۔ غرض کسی چیز کا پتہ نہیں۔ بس صرف انتظام تمدن کو لئے پھرتے ہیں حالانکہ اتنے بڑے بڑے کمالات کے ہوتے ہوئے صرف سیاست مدن کی تعریف کرنا ایسا ہے۔ سہ

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست   این نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

یعنے جیسے بادشاہ کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کیونکہ جولاہے نہیں ہیں۔ تو اس درجہ کی ہیں یہ سوانح عمریاں۔ خلاصہ یہ کہ مطاوعت و عظمت محبت یہ تینوں حقوق حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ادا کرنا چاہیئے۔ اور آپ سے اول حق تعالے

کے بھی حقوق مگر یہ محققین سے اور اُن کی کتابوں سے معلوم ہوگا کہ مطاوعت عظمت محبت کی حقیقت کیا ہے۔ تم اپنی طرف سے اُن کی تفسیر نہ گھڑنا وہی بتائیں گے۔ اور جنہیں آپ نے عظمت و محبت وغیرہ سمجھ رکھا ہے اُن کی حالت آپ کو ابھی معلوم ہوچکی ہے کہ واقع میں وہ مطاوعت و عظمت و محبت نہیں ہیں۔ بہرحال آپ کے ظاہری و باطنی دونوں قسم کے حقوق کو جمع کرو اور اس جمع کے طریق کو کسی ایسے محقق سے حاصل کرو جس کی جامعیت کی خود یہ شان ہو۔ ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اور یہ طریق جمع کا حاصل کرنا یا تو محققین کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے اگر زماناً ومکاناً قریب ہو یا اُن کے حکایات و ملفوظات کے مطالعہ سے اگر زماناً بعد ہو۔ یا اُن سے خط و کتابت سے اگر مکاناً بعد ہو۔ اب ایک بات[ع] اور رہ گئی اُس کے بعد ختم کردوں گا وہ یہ کہ حضور کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان سلطنت دوسری شان نبوت اور دونوں کے حقوق ہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پردہ میں ہیں۔ مگر آپ کی ان دونوں شانوں کے مظاہر موجود ہیں چنانچہ شان نبوت کے مظاہر حضرات صوفیہ کرام و علما ہیں اور شان سلطنت کے مظاہر مسلمان عادل بادشاہ ہیں۔ اس واسطے مظاہر ہونے کی حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کے حقوق ادا کرنا بھی تتمہ ہے حضور ہی کے حقوق کا۔ پس ہم کو ان کے حقوق بھی ادا کرنا چاہئے اور حضور کے غیبت ظاہری کے بعد انہیں غنیمت

ع اس مضمون کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہوئی تھی بعض محبان اسلام نے یہ درخواست کی تھی کہ مجلس وعظ میں حضور نظام جعلہ اللہ تعالیٰ معینا للاسلام کے لئے دعا کیجاوے۔ چنانچہ وعظ کے قبل ایک خاندانی حیدرابادی نوجوان نے ایک مختصر تقریر کے بعد تمام مجمع کیساتھ دعا کی اور وہ فرمائش ختم ہوگئی۔ مگر احقر کو ختم وعظ کے قریب دوبارہ دعا کا جوش ہوا۔ اور بجائے مستقلاً دعا کرنے کے اس عنوان خاص سے دعا کرتا ہوں اچھا معلوم ہوا۔ جس سے وہ دعا کا مضمون جزو وعظ بھی ہوگیا۔ اور دینی حیثیت سے اُس کی ضرورت بھی معلوم ہوگئی۔ اور اغراض دنیویہ کیشائبہ کے ایہام سے خلو بھی رہا۔ والحمد للہ۔ ۱۲ منہ

سمجھنا چاہئے بقول مولانا۔

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ　　　چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنے خورشید تو چھپ گیا ہے تو اب بجز چراغ کے اور کیا چارہ ہے۔ پس علماء کا حق یہ ہے کہ اُن سے دین کے احکام کو پوچھا جائے۔ اور یہ حق علماء کا مسلمان بادشاہوں پر بھی فرض ہے کہ اُن کو بھی اپنے احکام جاری کرنے کے قبل علماء سے استفتا کرنا چاہئے اور مسلمان بادشاہوں کا حق یہ ہے کہ امور انتظامیہ میں اُن کی اطاعت کی جاوے حتے کہ علماء کے ذمہ بھی ان امور میں اُن کی اطاعت ضروری اور ان دونوں جماعتوں کا مشترک حق سب کے ذمہ یہ ہے کہ ان کی بقاء کی اور اُن کی نصرت کی دعا کریں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان دونوں کو اپنے اپنے مناصب ادا کرنے کی توفیق دے۔ یعنے یہ دعا کریں کہ حق تعالےٰ علماء سے دین کی خدمت لے۔ اور سلاطین کو امت پر رحیم و شفیق بنا دے۔ اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ حق تعالےٰ انھیں دونوں جماعتوں کی برکات سے منتفع کرے۔ آمین (پھر تمام جماعت کے ساتھ عامہ مسلمین و علماء و سلاطین خصوص مقامی بادشاہ کے لئے فلاح دنیا و دین کے لئے دعاء کی گئی اور جلسہ ختم ہوا)

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶ من الخطیب

قولہ۔ اس مقام پر حضرات سامعین سے تفریعًا و تفریحًا ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر پاس سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا میں فتوی نہیں دیتا آپ ہی سے پوچھتا ہوں۔ اھ

اقول۔ اس مضمون کے متعلق وعظ کے بعد ایک صاحب خوش فہم نے بلدہ ہی میں مجھ سے ایک سوال تقریرًا کیا۔ اور ایک ذی علم نے بعد واپسی وطن میرے ایک رفیق سفر سے ایک خیال کا اظہار تحریرًا کیا۔ دونوں کو مع جواب افادہ ناظرین کے لئے نقل کرتا ہوں۔ +

سوال تقریری۔ جس کے الفاظ بعد زمان کے سبب یاد نہیں معنے یہ تھے کہ یہ استدلال کس درجہ کا ہے۔

جواب۔ اُس وقت غالباً اتنا عرض کیا تھا کہ عام لوگوں کی سہولت فہم کے لئے اس وقت ایک لطیفہ کے عنوان سے کہدیا گیا تھا بعد میں اس کی تکمیل کردی جاوے گی چنانچہ اس وقت اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں۔

تحقیق۔ اس مضمون کی یہ ہے کہ نداء من وراء الحجرات سے نہی کی علت صرف یہی ہے کہ یہ ندا کمال ادب کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ اس نداء کا کمال ادب کے خلاف ہونا نہ ایسا جلی تھا کہ اعراب کی عقول بدون تنبیہ یا تامل کے اُس کا ادراک کر سکتے اور نہ کسی نص سے اس پر دلالت کی گئی تھی باوجود اس کے اس کو مذموم اور اس کے فاعل کو ملوم قرار دیا گیا اور نداء من البعید جس اعتقاد اور قصد سے اکثر عوام میں شائع ہے وہ یہ کہ آپ کو لزوماً اطلاع بھی ہو جاتی ہے اور آپ اُس کی اجابت اور منادی کی اعانت بھی فرماتے ہیں اس سے نہی صریح وارد ہے تو یہ منہی عنہ ہونے میں اس سے اشد و اثقل ہوا پھر جب اخف کو جائز نہیں رکھا گیا تو اشد و اثقل کیسے جائز ہو جاوے گا۔ سو حاصل اس مضمون کا استدلال بدلالۃ النص ہے جیسے حرمت تافیف سے حرمت ضرب و شتم پر استدلال کیا جاتا ہے پس معنون مضمون علمی و برہانی ہے گو عنوان بصورت لطیفہ ہونیکے سبب خطابی ہے۔

جبال تحریری۔ یہ ایک خط ہے جو بعینہ درج کیا جاتا ہے۔

مولوی صاحب السلام علیکم فدوی بلدہ میں جناب سے نیاز حاصل کیا ہے اور حضرت اقدس کے جملہ مواعظ کی مجلسوں میں شرکت حاصل کر کے مستفید ہوا۔ اور اب اس وقت اپنے وطن میں آچکا ہوں بلدہ میں آپ کی روانگی کے بعد مجھ سے ایک مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی غالباً وہ مولوی صاحب بغداد کی طرف کے باشندہ ہیں۔ مگر عرصہ سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ اور حضرت اقدس سے ایک وقت ملاقات کئے تھے اور دونوں وعظ میں بھی شریک تھے اچھے عالم ہیں محقق و موحد معلوم ہوتے ہیں مولانا کے ثنا خواں ہیں مگر انوار العلوم نام پلی میں جو وعظ ہوا اُس کے آخری حصہ میں مولانا نے فرمایا تھا کہ آنحضرت صلعم

کا ہندوستان سے پکارنا بے ادبی ہے یا نہیں اس پر غور کرو میں فتوے تو نہیں دیتا۔ اس پر وہ مولوی صاحب میرے سے یہ تذکرہ فرما رہے تھے کہ اس مقام پر کچھ تشریح ہو جاتی تو بہتر تھا۔ کیونکہ بعض صورتیں پکارنے کی جائز بھی ہیں چنانچہ فرط محبت سے اگر پکارا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے اس خاکسار نے جرأت کر کے اس کیفیت کی اطلاع حضرت اقدس کو دی ہے (یہ مجکو یاد نہیں ۱۲ اشرف علی) اور احتیاطاً آپ سے بھی عرض کیا جاتا ہے کہ واقعی مولوی صاحب موصوف کی رائے اگر درست نہیں ہے تو خصوص بلدۂ حیدرآباد کے لحاظ کرتے ہوئے منجانب کاتب وعظ یا خود حضرت اقدس کی جانب سے وعظ کے حاشیہ میں اس کی تشریح ہو تو مناسب و بہتر ہوگا مخفی مبادکہ میں نے ایک اہل بدعت کی کتاب میں جملہ قسم ندا کے جواز کا فتوے دیکھا۔ مگر میں صرف مولوی صاحب مذکور کی رائے کے موافق چند جائز صورتیں درج ذیل کرتا ہوں اس لئے اگر یہ صورتیں جائز ہیں یا نہیں اس کا علم مجکو بھی ہو جائے۔ +

صورت اول۔ ندا بطریق تعبد ہے مثلاً کوئی شخص سورۂ یا ایہا المزمل پڑھتا ہے تو صرف بطریق تعبد تلاوت قرآن کرتا ہے۔ یا التحیات میں بھی بطریق عبادت السلام علیک ایہا النبی۔ جس میں عالم غیب نہیں سمجھا جاتا۔

(۲) کبھی متکلم علم بدیع و فصاحت کے قاعدہ سے شخص غائب کو فرضی طور پر دل میں حاضر تصور کر کے مخاطب کرتا ہے جیسا کہ قصیدہ بردہ وغیرہ میں ہے۔

(۳) کبھی فرط غم و فرط محبت میں اپنے عزیز یا محبوب سے ندا کی جاتی ہے۔ پہلی صورت ندا کی تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ اب رہی دوسری و تیسری صورت اگر فرضی طور پر اس طرح ندا کی جائے اور مخاطب کو در اصل حاضر و ناظر یا عالم الغیب نہ سمجھے تو اس میں کیا حرج ہے آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔ براہ کرم مولانا کا اس میں کیا ارشاد ہے دریافت فرما کر مطلع فرمائیں یا آپ خود اپنی رائے سے مطلع فرمائیے تو نہایت مہربانی ہوگی۔ بصورت جواز اگر مصلحت معلوم ہو تو وعظ مذکور کے حاشیہ میں تشریح ہو جائے۔

جواب

یہ تفصیل صحیح ہے اور اس سے مجکو اتفاق ہے۔ لیکن اس میں اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ اگر صورت ثانیہ و ثالثہ میں خواص کے فعل سے عوام کے فساد عقیدہ کا اندیشہ ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عوام پر اپنے فعل کا اظہار نہ کریں فقہا حنفیہ نے اس مسئلہ کی تصریح فرمائی ہے اور اسی مصلحت سے وعظ میں اس تفصیل کا اظہار مناسب نہ تھا کہ عوام کے لئے حیلہ نہ ہو جائے دوسرے یہ مضمون محض استطراداً بیان میں آگیا تھا استقلالاً نہ تھا اس لئے بھی تفصیل کی طرف ذہن کو توجہ نہیں ہوئی۔ بخبر اب اتفاق سے تفصیل ہوگئی۔

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ ۞ انتہت الحاشیۃ

کتبہا اشرف علی فی اوائل شعبان سنہ ۱۳۴۴ ہجری

بعد سنتین ونصف من زمان الوعظ

تمت

حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب مدظلہم کے مضامین کا ماہوار رسالہ

النور

یہ رسالہ جمادی الاولی سنہ ۱۳۳۹ھ سے شروع ہوا اور بحمد اللہ اسوقت تک مسلمانوں کی خدمت میں مضامین عالیہ نافعہ پہونچاتے ہوئے چھ سال ختم ہو کر ساتواں سال جمادی الاولی سنہ ۱۳۴۵ھ سے شروع ہوا ہے وقتی و جدید مضامین کے علاوہ مستقل مضامین حسب ذیل اسمیں شائع ہو رہے ہیں۔

تربیۃ السالک۔ احکام باطنی کا مجموعہ ذکر و شغل کرنیوالے حضرات حکیم الامۃ دام ظلہم کیخدمت میں اپنے باطنی حالات عرض کرتے ہیں اور اُنکے جوابات حکیم الامۃ دام ظلہم عطا فرماتے ہیں وہ حسب الحکم حضرت حکیم الامۃ دام ظلہم یکجا جمع کر لئے جاتے ہیں اور پھر شائع ہوتے ہیں سالکین و مشائخ کیلئے اس سے بہتر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی علوم مکاشفہ و کلیات علوم معاملہ کی متعلق بہت سی کتابیں ملینگی مگر جزئیات علوم معاملہ کی متعلق اسی زمانہ میں ایک یہ کتاب جمع ہوئی ہے گویا ایک طب روحانی جمع کر دیا گیا ہے کہ اُسکے مطالعہ سے سالک نفس و

شیطان کے دہوکے سے بچ سکتاہی، اور مشائخ کی بھی لاکھوں مشکلات اس سے حل ہوتی ہیں۔ یہ مضمون سالکین کے لئے خصوصًا اور سب مسلمانونکے لئے عمومًا نہایت ضروری اور قابل دید ہے۔ **امداد الفتاویٰ**۔ احکام ظاہری کا مجموعہ یعنے جو حضرات احکام ظاہر کے متعلق سوال کرتے ہیں اور اُنکے جوابات حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم کی جانب سے عطا ہوتے ہیں اُنمیں اہم مسائل کے جوابات بحکم حضرت حکیم الامتہ نقل کر لئے جاتے ہیں جس سے کہ بے انتہا جزئیات کا احاطہ ہو جاتا ہی۔

حوادث الفتاویٰ۔ یعنی وہ فتاویٰ جو اس زمانہ کی جدید تحقیقات و مصنوعات وغیرہ کے متعلق سوالات آتے ہیں اُنکے جوابات یہ احکام اس مجموعہ کے سوا پہلے بڑی بڑی فتاوی میں بھی نہ ملیں گے **ترجیح الراجح**۔ یہ وہ مجموعہ ہی جسکی نظیر سلف میں تو شاید مل بھی جاوے لیکن اس زمانہ میں (ہماری علم میں) سوائے حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم کے اور کسی کے یہاں یہ سلسلہ نہیں دیکھا گیا۔ یعنی اگر کوئی شخص حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم کے کسی مسئلہ یا مضمون کے متعلق کوئی شبہ پیش کرے اور یہ ثابت ہو جاوے کہ اُس مضمون میں کچھ تسامح ہو گیا ہے تو فورًا اُس مسئلہ سے اس مجموعہ میں رجوع شائع کرا دیا جاتا ہی ورنہ اُن صاحب کی رائے کو بھی شائع کر دیا جاتا ہے تا کہ ناظرین خود علماء سے فیصلہ کر کے عمل کریں آخرت کا بار اپنے اوپر نہ رہے۔ یہ ہے حقیقی خشیت عن اللہ۔ **الشفاء** تفسیر بیان القرآن میں آیات قرآنی پر شبہات جدیدہ کے جو کافی شافی جوابات دئے گئے ہیں اُنکو اس طور سے یکجا جمع کیا جاتا ہی کہ اول آیت لکھی گئی پھر سوالات قائم کر کے اُنکے جوابات تفسیر سے نقل کر دئے جاتے ہیں۔ نو تعلیم یافتہ حضرات کیلئے انشاء اللہ اکسیر اعظم ہے۔ **مکتوبات حسن العزیز**۔ یہ بھی سوالات باطنی کے جوابات ہی کا مجموعہ ہے تربیۃ السالک ہی ہے اور اسمیں صرف اسقدر فرق ہی کہ اُسمیں صرف اُن حضرات کے حالات درج ہوتے ہیں جو حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم سے بیعت بھی ہوتے ہیں اور اسمیں اُن حضرات کے حالات درج ہوتے ہیں جو بیعت نہیں۔ **احوال الصادقین**۔ علامہ شعرانی کی کتاب تنبیہ المغترین کا جناب مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی کا کیا ہوا نہایت سلیس اردو ترجمہ یہ کتاب بھی تصوف کی جان ہی۔ **الدر المنضود**۔ حصہ دوم علامہ شعرانی سے اُنکے شیوخ نے جو عہد لئے ہیں کہ اُنمیں حقیقی تصوف کی تعلیم اور سالک کی تربیت ہی۔ اُنکو علامہ موصوف نے اپنی کتاب بحر المورود میں جمع فرمایا ہے۔ یہ اُسکا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم جناب مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی ہیں۔ **ولادت محمدیہ کا راز**۔ تاریخ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں کیا راز تھا۔ **اسباب المحمودیہ**۔ علامہ شعرانی رح نے اپنی کتاب آداب العبودیۃ میں مشائخ کی شرائط اور آداب بیان فرمائے ہیں یہ اُسکا سلیس اردو ترجمہ ہے جناب مولوی ظفر احمد صاحب موصوف نے ہی اسکا بھی ترجمہ فرمایا ہے۔ **غرض** یہ رسالہ کیا ہی گویا ایک نسخہ ہے جس سے گھر بیٹھے فیض لیتے رہیے۔ **قیمت** سالانہ معہ محصول ڈاک (عہ) ہے وی پی کرنیکی صورت میں ۲ر رجسٹری اور ۲ر فیس منی آرڈر اضافہ ہو کر (عا) ڈاکخانہ میں داخل کرنا ہوتے ہیں۔ ✢

المشتہر

احقر محمد شبیر علی مدیر رسالہ النور و مالک اشرف المطابع تھانہ بھون ضلع مظفر نگر